ارشد محمود ارشد نمبر

مردان سے اکیسویں صدی کا پہلا اردو علمی اور ادبی کتابی سلسلہ

سہ ماہی

املاک 6

مردان

جنوری تا مارچ 2024

ایڈیٹر انچیف۔۔ شاہ روم خان ولی

ایڈیٹرز۔۔ ڈاکٹر اسحاق وردگ۔۔ عزیز عادل

سہ ماہی املاک مردان ارشد محمود ارشد نمبر جنوری تا مارچ 2024

Volume no. 6

Literary and conative journal

Quarterly

AMLAAK

Mardan KP

ARSHAD MEHMOOD ARSHAD NUMBER

Chief Editor: SHAH ROOM KHAN WALI

Editors. Dr Ishaq Wardag & Aziz Adil


بسم اللہ الرحمن الرحیم

سہ ماہی املاک مردان

چھٹا شمارہ

ارشد محمود ارشد نمبر

جنوری تا مارچ 2024ء

مردان سے اکیسویں صدی کا پہلا
علمی اور ادبی کتابی سلسلہ

شمارہ حاصل کرنے کے لیے یہاں سے رابطہ فرمائیے

یونی ورسٹی بک ایجنسی خیبر بازار پشاور
ادب محل، سٹی ٹاور کابلی بازار پشاور
سید بک بینک قاضی پلازہ، گور گورے چوک تیمرہ گرہ دیر پائین
اکبر بک سیلرز، مقام چوک مردان
شمع بک ایجنسی پاکستان چوک مردان
فضل بک سیلرز اینڈ سپورٹس سینٹر مالاکنڈ چوک مردان

ضابطہ

سرنامہ	:	سہ ماہی املاک مردان ارشد محمود ارشد نمبر۔۔چھٹا شمارہ
ایڈیٹر انچیف	:	شاہ روم خان ولی 03452157824
مدیران	:	ڈاکٹر اسحاق وردگ۔۔عزیز عادل
مدیرہ	:	نازیہ نزی
قانونی مشیر	:	ایڈووکیٹ عابد معروف مغل۔۔نوید اسلم کھوٹ
سرکولیشن منیجر	:	انوار احمد شام
دوستانِ املاک	:	امین اڈیرائی۔اکرم جاذب۔گوہر رحمان گہر مردانوی۔
تقویمی حوالہ	:	سن دوہزار چوبیس 2024
حروف چینی	:	شاہ روم خان ولی 03369759678
سرورق	:	ولی گرافکس 03257157876
اہتمام	:	بزمِ ولی پاکستان
طابع	:	املاک پبلی کیشن مردان
مبادلہ	:	تین سو روپے پاکستانی
بین الاقوامی معیاری کتابی عدد		

تسبیع

ارشد محمود ارشد بحیثیت شاعر

متفرق شعراء کے فلیپ

منتخب کلام ارشد محمود ارشد

اداریہ

چھٹا پڑاؤ

مردان خیبر پختون خواہ سے اکیسویں صدی میں پہلا علمی اور ادبی کتابی سلسلہ ''سہ ماہی املاک مردان'' کا چھٹا شمارہ '' ارشد محمود ارشد نمبر'' پیش کرتے ہوئے بے حد مسرت ہو رہی ہے۔اس سے پہلے کے شماروں کو اہلِ علم و دانش نے پسند فرمایا،اس میں دل چسپی لی اور اپنی قیمتی آرا سے نوازا۔توقع ہے کہ اس ادبی جریدے کا زیرِ نظر شمارہ بھی مشمولات اور پیش کش کے سبب اپنا مقام اور وقار ضرور حاصل کرے گا۔

زیرِ نظر شمارہ ''ارشد محمود ارشد نمبر'' کا خاص نمبر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔جناب ارشد محمود ارشد نے اپنی شاعری میں کلاسیکی روایت کی پاس داری کے ساتھ ساتھ ترقی پسندی اور جدیدیت کے رجحانات و اثرات کو بھی قبول کیا ہے۔ کلاسیکی، ترقی پسندی اور جدیدیت کی حسین آمیزش سے اُن کی شاعری کا ایک منفرد رنگ وآہنگ وجود میں آیا ہے۔ان کے ہاں تخلیقی توانائی اور وفور ہے اور فکری تازگی بھی ہے۔ان کے ہاں جمود و تعطل نہیں،بلکہ ایک تحرک و تموج ہے۔ان کا زاویۂ نظر بہت وسیع ہے. جناب ارشد کے کلام میں تفکر و تعقل،طنز و مزاح، حسن و عشق کی داستاں، عصری مسائل و موضوعات کے ساتھ ساتھ تصوف و سلوک کے رموز و اسرار کی جلوہ گری بھی ہے۔ اُن کی شاعری میں عمدہ تشبیہات،استعارات اور تلمیحات کا بھی ہنر مندانہ استعمال ہوا ہے۔

سہ ماہی املاک مردان اپنے قارئین تک اعلیٰ اور معیاری ادب پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔یہ کوشش آپ کے تعاون کے بغیر ناممکن ہے آپ سے استدعا ہے کہ اپنے نگارشات ارسال کر کے اس جریدے کے کارواں میں شامل ہو جائیں۔اس کا بطور خاص خیال رکھیے کہ '' سہ ماہی املاک مردان'' صرف غیر مطبوعہ نگارشات شائع کرنے میں یقین رکھتا ہے لہذا جب آپ اپنی کوئی تحریر ہمیں ارسال کر دیں تو پھر اسے کہیں اور اشاعت کے لیے روانہ نہ کیجیے اور نہ ہی سوشل میڈیا پر دیجیے۔ چونکہ ادب تہذیبی وثقافتی مطالعہ زیرِ نظر جریدے کی اولین ترجیح ہے اس لیے ایسے مضامین کو اولیت دی جاتی ہے۔ہمیں آپ کے مفید مشوروں کا انتظار رہے گا تاکہ شمارے کو مزید بہتر اور معیاری بنانے کی جانب مثبت پیش قدمی کی جا سکے۔



شاہ روم خان ولی
03452157824

مختصر کوائف

ارشد محمود یکم فروری 1975 کو سرگودھا کے ایک گاؤں چک نمبر 96 جنوبی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گورنمنٹ پرائمری سکول مجاہد کالونی سے حاصل کی مڈل، ندیم اکادمی سے کیا اور میٹرک ایم سی ہائی سکول سٹلائٹ ٹاون سرگودھا سے کیا شعر کہنا تو میٹرک میں ہی شروع کیا۔ لیکن ان کی یہ ابتدائی شاعری فردیات پر ہی مشتمل تھی جس کے بارے ان کا کہنا ہے کہ ہمارے اردو کے استاد عبدالرشید صاحب بہت اچھا ادبی ذوق رکھتے تھے اور اکثر کلاس میں شعر سنایا کرتے تھے۔ میں نے بھی انہی سے متاثر ہو کر شعر کہنا شروع کر دیا۔ لیکن یہ مشق سخن کا دور تھا اور تک بندی ہی ہوتی تھی۔

ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو زیادہ پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ 2001 میں جب وہ الحسیب ہومیوپیتھک کالج میں D.H.M.S کر رہے تھے وہاں بھی انھیں ادبی ذوق رکھنے والے اساتذہ میسر آئے۔ کالج میں ہر جمعرات کو بزم ادب کا اہتمام کیا جاتا جس میں تمام شرکاء اپنی اپنی پسند کے اشعار سناتے وہیں سے ادبی ذوق مزید پروان چڑھا اور پھر 2004 میں اُن کی ملاقات جناب خالد یوسفی سے ہوئی انہی سے ابتدائی اصلاح بھی لی اور باقاعدہ طور پر ادبی دنیا میں قدم رکھا۔

ماں باپ نے نام ارشد محمود رکھا اور انھوں نے ارشد محمود ارشد کے نام سے ادبی افق پر اپنی ایک الگ پہچان بنائی۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ 2007 میں شائع ہوا۔ بہت سے ادبی رسائل و میگزین میں ان کا کلام تواتر سے شائع ہوتا رہا انہیں رسائل میں ایک میگزین ماہنامہ ریشم، بھی تھا جس کے ادبی صفحہ کے انچارج ارشد محمود ارشد بھی رہے۔ ریشم کے توسط سے ہی ان کا رابطہ جناب امین اوڈیرائی اور شاہ روم سے ہوا۔ ارشد محمود ارشد نے ان دونوں شخصیات کے ساتھ مل کر ایک ادبی تنظیم بزم فراز بنائی جس کے وہ بانی چیرمین تھے جناب امین آڈیرائی صدر اور شاہ روم خان نائب صدر مقرر ہوئے۔ اس تنظیم کے زیرِ اہتمام اُس دور کا ایک منفرد کام آن لائن مشاعروں کا آغاز ہوا اور 121 آن لائن مشاعروں کا انعقاد کیا اور نوجوان شعراء کو سینئرز کے ساتھ ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کیا مضافاتی علاقوں کے شعراء کی پذیرائی کی۔ بزم فراز کے زیرِ اہتمام انھوں نے چار شعری انتخاب بھی شائع کیے۔ سوشل میڈیا پر بھی بہت متحرک ہیں 2017 میں پذیرائی کے عنوان سے فیس بک پر ایک گروپ کا قیام عمل میں لائے اور 505 شعراء کے تعارف و کلام کی پذیرائی پر مبنی کتاب بھی اشاعت کے مراحل میں ہے۔ جس میں نوجوان لکھاریوں کی ایک بڑی تعداد ہے۔ یہ سلسلہ چلتا رہا 2020 میں اپنے ایک دوست ڈاکٹر ملک محمد یوسف کے ساتھ مل کر جناب ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کی سرپرستی میں بزم الکرم بنائی جس کے وہ جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے۔ ڈاکٹر شفیق آصف اور ذوالفقار احسن صدور منتخب ہوئے۔ اس تنظیم نے نوجوانوں کو بھرپور مواقع فراہم کیے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا سکیں۔ 2021 میں ارشد محمود رشد کو عالمی ادب اکادمی نے پہلا مرکزی جنرل سیکرٹری منتخب کیا۔ اسی سال بزم کامران کی بنیاد محترمہ منزہ انور گوئیدی نے رکھی جو کہ معروف شاعر جناب انور گوئیندی مرحوم کی صاحبزادی ہیں انھوں نے جنرل سیکرٹری بزم کامران کے لیے ارشد محمود ارشد کا انتخاب کیا۔ 2021 میں ہی پنجابی ادبی محفل جو کہ سرگودھا میں پنجابی زبان وادب کے فروغ کی پہلی تنظیم تھی اور جس کی بنیاد جناب پروانہ شاہ پوری نے رکھی تھی ان کی وفات کے بعد عرصہ دراز تک غیر فعال رہی۔ پنجابی ادبی محفل کے صدر جناب ممتاز عارف نے پنجابی ادبی محفل کی از سر نو تنظیم سازی کا فیصلہ کیا اور انہیں نے اس کا نائب صدر ارشد محمود ارشد کو منتخب کیا۔ آپ ادبی تنظیم ادب رنگ کے بھی جنرل سیکرٹری ہیں۔ ارشد محمود ارشد کے اب تک چار شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ جن میں 1: عجب سی بے قراری ہے (2007) 2: "کبھی میں یاد آؤں تو (2009) 3: شام کی دہلیز پر (2014) 4: بساطِ زیست (2017) اس کے علاوہ انھوں نے چار انتخاب مرتب کیے۔ 1: "محبت بانٹ لیتے ہیں 2010 2:

نبیؐ کا قصیدہ(نعتیہ انتخاب)2010 3:تمہاری یاد کا موسم۔۔2011 4:کوئی تعبیر دو مجھ کو...2011 آپ کی ادبی خدمات کے پر مقالہ جات بھی لکھے جا چکے ہیں۔

ارشد محمود ارشد کی شاعری کا فکری وفنی جائزہ" کے عنوان سے سرگودھا یونیورسٹی میں سیشن 2014 / 2016 ایم اے کی سطح پر مقالہ لکھا گیا۔اور ان کے تیسرے شعری مجموعہ،، شام کی دہلیز پر،، کا تجزیاتی مطالعہ، مقالہ برائے بی ایس اردو سیشن 2019تا،2023 گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج برائے خواتین، وہاڑی سے بھی لکھا جا چکا ہے۔اس کے علاوہ اُن کو اب تک جو ایوارڈ و اعزازات ملے ہیں ان میں سے کچھ درج ذیل ہیں۔ 1:ورلڈ پیس اینڈ لیٹریری ایوارڈ ۔۔2010 2:ریشم رائٹرز ایوارڈ 2014 3:نقیبی کاروانِ ادب ایواڈ 2014 4:روزن شیلڈ 2014 5: ریشم رائٹرز ایوارڈ 2015 6:ریشم رائٹرز ایوارڈ 2016 7: مولانا الطاف حسین حالی ایوارڈ 2017)ادبی تنظیم بیسٹ اردو شاعری 8: محسن نقوی ایوارڈ 2018(ادبی تنظیم فکر نو) 9:اعترافِ فن ایوارڈ 2021(ادبی تنظیم عالمی ادب اکادمی) 10: بہزاد لکھنوی ایوارڈ 2022(موج سخن) 11:نشانِ ادب ایوارڈ 2021(سخن پورہ) 12:انٹلکچول ان لٹریچر ایوارڈ 2022(رحمانی ویلفیر ٹرسٹ پاکستان) 13:انور گوئینیدی صدی گولڈ میڈل 2022(بزمِ کامران) 14:علامہ اقبال ایوارڈ،ادبی تنظیم پاکستان ادب اکادمی۔ارشد محمود ارشد نے سخنوری، سخن پروری اور سخن شناسی کے ساتھ ساتھ حصولِ علم کی تگ و دو بھی جاری رکھی اور ڈی ایچ ایم ایس کے بعد جو تعلیمی سلسلہ منقطع ہو گیا تھا اسے دوبارہ بحال کیا اور 2023 میں ایم اے اردو مکمل کیا۔ارشد محمود ارشد ایک شخصیت کا نہیں بلکہ ایک ادارے کا نام ہے۔آپ کے ساتھ جو لوگ متحرک رہے ان میں بزم فراز میں جناب امین اوڈیرائی اور شاہ روم ولی بہت متحرک تھے۔ بزم الکرم میں ڈاکٹر ہارون الرشید قسم،ڈاکٹر ملک محمد یوسف،ڈاکٹر شفیق آصف، ذوالفقار احسن،اسامہ منیر اور اسامہ یوسف، عالمی ادب اکامی میں سب سے متحرک شخصیت بانی و سرپرست جناب ملک عرفان خانی، بزم کامران میں محترمہ منزہ انور گوئیندی، پنجابی ادبی محفل میں جناب ممتاز عارف، ڈاکٹر آصف راز اور مومن ہاشمی،ادب رنگ میں ڈاکٹر شفیق آصف کے نام نمایاں ہیں۔آپ نئے لکھنے والوں کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتے رہتے ہیں۔اس سلسلے میں عالمی ادب اکادمی اور بزم کامران نے ایوارڈز کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔آپ موجودہ دور میں کتب بینی کے کم ہوتے رجحان پر افسردہ ہیں۔آپ کے خیال کے مطابق بد قسمتی سے موجودہ دور میں کتاب بینی کا شوق تقریباً ختم ہو گیا ہے ادبی کتابوں کی فروخت نہ ہونے کے برابر ہے ایسے میں شاعر و ادیب کے ساتھ ساتھ پبلیشرز بھی پریشان ہیں کوئی بھی پبلیشر اپنے خرچ پر کتاب شائع کرنے کا رسک نہیں لیتا۔ شاعر و ادیب بے چارہ اپنی جمع پونجی سے کتاب شائع کراتا ہے اور پھر تقریباً مفت تقسیم کرتا ہے پبلیشرز کو چاہیے کہ وہ اپنا منافع جس حد تک ہو سکے کم رکھے۔ نئے لکھنے والوں کو ادب کے اس رہبر کی یہ بات یاد رکھنی چاہیے۔دوسروں کے لیے آسانیاں پیدا کریں یقین کریں آپ کی اپنی مشکلات کم ہوتی جائیں گی۔



حمد باری تعالیٰ

کیا تری تعریف ہو اے مالکِ دونوں جہاں
جس طرف دیکھا نظر آیا ہے تُو ہی تُو وہاں

ذرہ ذرہ دے رہا ہے تیری قدرت کی خبر
بحر و بر یہ پیڑ پودے تیرے ہونے کے نشاں

چلنے پھرنے کے لیے تُو نے عطا کی یہ زمیں
بے ستونوں کے کیا ہے تُو نے قائم آسماں

تُو ہی مالک تو ہے مولا تُو ہی پالن ہار ہے
دل کی ہر دھڑکن میں تُو ہے تُو ہی رگ رگ میں رواں

جس کے دل میں جو چھپا ہے تجھ کو سب معلوم ہے
پر کرے نہ راز افشا تُو ہی سب کا رازداں

ناتا جس نے تجھ سے جوڑا منزلیں وہ پا گیا
کیوں بھٹکتا پھر رہا ہے ہمارا کارواں

یوں تو ہر اک شے ہے فانی ایک دن ہو گی فنا
اک ترا ہی نام دنیا میں رہے گا جاوداں

نعت رسولِ مقبول ﷺ

آپؐ کا ذکر ہو محشر میں سہارا میرا
نعت کہتے ہو جو دنیا سے کنارا میرا

ورد ہونٹوں کا بنایا ہے محمدؐ میں نے
کیوں نہ ہو بامِ ثریا پہ ستارہ میرا

آپؐ کے در کا گدا ہوں تو کوئی خوف نہیں
یا نبیؐ آپؐ کے ٹکڑوں پہ گزارا میرا

سوئے طیبہ سے جو ہو آئے یہی چاہے سدا
کاش اک بار بلاوا ہو دوبارہ میرا

ہر گھڑی گونجتی رہتی ہے صدا کانوں میں
کہہ دو عشاق سے کر لیں وہ نظارہ میرا

میں بھی اے کاش کہ روضے کی زیارت کر لوں
کاش کے ہو درِ اقدس سے اشارہ میرا

جب مصیبت میں کبھی دل سے پکارا ارشدؔ
یا نبیؐ آپ نے ہر کام سنوارا میرا

رومانیت کا شاعر

ڈاکٹر شاکر کنڈان۔۔سرگودھا

''عجب سی بے قراری ہے'' یہ نام ہے اس کتاب کا جو ہمارے زیرِ نظر ہے۔اس نام سے کوئی کیا سمجھتا ہے۔؟کہاں تک صحیح سمجھتا ہے۔؟اس کی گہرائی میں کیا ہے؟ گیرائی اسے کیا معانی پہناتی ہے؟ بے قراری تو بے قراری ہے اس میں عجب کیا ہوا۔؟اور کئی سوالات ذہنوں میں ابھر سکتے ہیں لیکن ان سوالات سے اس لئے کوئی سروکار نہیں رکھا جا سکتا کہ ,,عجب سی بے قراری ہے،، میں کوئی ایسا پہلو نہیں کہ جسے سمجھنے میں دقت ہو۔صفحات سامنے ہیں اگر دل میں کوئی سوال پیدا ہوتا بھی ہے تو ورق الٹیے الٹتے جائیے۔جواب خود ہی سامنے آجائے گا۔بشرطیکہ اوراق الٹ کر ان کا مطالعہ کریں۔

ارشد محمود ارشد کی ساری بے قراری اس کی محبت کے باعث ہے۔محبت کی بے قراری ہی تو انسان کے اندر ایک ایسے انسان کو جنم دیتی ہے۔جو بہت کچھ سوچتا ہے۔اور یہ بے قراری تب وجود میں آتی ہے۔جب انسان محبت کی تلاش کرتا ہے۔اسے پانے کی تگ و دو کرتا ہے۔کبھی پالینے کی خوش گمانی پیدا ہوتی ہے اور پھر یہی خوش گمانی ناکامی کا سبب بنتی ہے۔۔۔۔۔۔صحرا بہ صحرا اور کو بہ کو تلاشنے کے باوجود ناکامی یقین کو بھی گمان میں بدل دیتی ہے تو اندر کا انسان اپنے ہی الفاظ کا سہارا لیتا ہے۔

پھرے صحرا بہ صحرا کو بہ کو جس شخص کی خاطر
گماں کب تھا وہ یوں مل کر دوبارہ کھو بھی سکتا ہے

یقیں تھا سامنے ہے یہ میں جا پہنچوں گا منزل تک
گماں کب تھا مقدر کا ستارہ کھو بھی سکتا ہے

یہ یقین جب گماں کی صورت اختیار کر لیتا ہے تو صحرا میں سراب کا منظر ہوتا ہے۔اور سراب تو ہے ہی دھوکا۔۔۔۔۔ایسا دھوکا، جو خوش فہمی سے چل کر مایوسی پر آکر دم توڑ دیتا ہے۔اور پھر شاعر خود سے مخاطب ہو کر اپنی سوچوں کے دھارے کو بدلنے پر آمادہ کرنے کے لئے کہتا ہے۔

جانے والے جب تمہیں اب لوٹ کر آنا نہیں
بے سبب دل کو جلاتا ہوں تمہاری یاد میں

تند لہروں سے وہ آخر کب تلک بچ پائے گا
ریت کا جو گھر بناتا ہوں تمہاری یاد میں

رومان میں ہجر و وصال کو غزل کا اہم حصہ کہا جاتا ہے اور جب ہجر و وصال کی کیفیت کو ظاہر نہ کیا جائے تو اسے ہم رومانویت سے تعبیر نہیں کر سکتے۔ یوں رومانیت کی زندگی ہجر و وصال کی سانسوں سے ہے تو گویا ارشد کی غزل زندہ ہے۔ جس میں اس نے فراق کو بھی ملاقات بنا دیا ہے۔ اور وصال کو ہجر کے پر لگا دیئے ہیں۔ ایسے کہ قاری ہجر و وصال کی معنویت کو بھول کر الجھ جاتا ہے کہ کیا سوچے اور کیا سمجھے۔ اسے جاننے کے لیے اس کی نظم ،، اداسی گھیر لیتی ہے ،، کا مطالعہ ضروری ہے۔

میں یہ نہیں کہتا کہ ارشد نے ادبی ماحول میں آنکھ کھولی یا اسے بھرپور ادبی شعری ماحول زیادہ ملا۔ ایسی بات نہیں بلکہ اس نے اپنے اندر ایک ایسا ماحول پیدا کر دیا کہ وہ سر تا پا شعری ماحول ہے اور محبت نے اس کو مزید مہمیز دی۔ کچھ لوگوں بلکہ اکثریت کا یہ خیال ہے کہ شاعری کے لیے صنف مخالف سے محبت کرنا ضروری ہے۔ میں یہ تو یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ ارشد نے محبت کی ہے، محبت پر کھی ہے یا اسے برتا بھی ہے لیکن یہ جاننے کے لیے اس کی شاعری کو کھنگالنا ضروری ہو جاتا ہے بلکہ زیادہ گہرائی کی بھی ضرورت نہیں پڑتی جستہ جستہ پڑچول سے بھی یہ احساس پختہ ہو جاتا ہے کہ ارشد محبت کا سخنور ہے۔ رومان کا شاعر ہے اور شعر کہتے ہوئے سوچ سے جب آگے نکلتا ہے تو رومانویت کو خود پر طاری کر لیتا ہے۔ اور وہ بھی کچھ ایسی کہ :

کاش ایسا ہو کہ ارشد مجھ سے آ کر وہ کہے
آ چلیں ہم ساتھ دونوں ضد پرانی چھوڑ کر

کہا اس نے محبت ہے مگر اک شرط لازم ہے
کہا میں نے کبھی ہوتی نہیں یہ ضابطوں کے ساتھ

کہا اس نے کہ ارشد دن میں سپنے دیکھتے کیوں ہو
کہا میں نے کروں میں کیا بہت نادان ہیں آنکھیں

ارشد محمود ارشد نے کئی بار دل سے ہٹ کر دماغ سے شعر کہنے کی بھی کوشش کی لیکن شاید وہ اس میں ناکام رہا۔ کیونکہ ایسے اشعار جو اس نے دماغ سے سوچ کر نکالے ،، عجب سی بے قراری ہے ،، کے مطالعے میں بالکل الگ دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں جان بھی ہے روانی بھی ہے ایک تسلسل بھی ہے لیکن جذبوں کی بات بہر حال اپنی ہوتی ہے۔ اور اس کا رنگ یہاں بھی علیحدہ نظر آتا ہے اور ایسی بات ذہن کے ساتھ جذبوں کی سچائی مل کر ہی قرطاس پر کامیابی سے الیک سکتی ہے۔

جو شاخیں خشک ہو جائیں تو ان پر گل نہیں کھلتے
جو راہِ زندگانی میں بچھڑ جائیں نہیں ملتے

وہ شاید اس لیے بھی پھول تحفے میں نہیں دیتے
کہ ہم تخلیق نہ کر لیں کوئی شہکار پھولوں سے

بدل ڈالی ہے ہر شے موسموں کے اس تغیر نے
جدا ہونے لگی ہے اب یہاں مہکار پھولوں سے

میں نے اپنی زندگی کا تجزیہ کرتے ہوئے ایک بار اس حقیقت کا اظہار کیا تھا

جو کام بھی کیا بڑی تا خیر سے کیا
کیا کیا مذاق ہم نے بھی تقدیر سے کیا

اور آج مجھے زیرِ نظر صفحات اور ان کے خالق کو دیکھ کر اس کے بارے کہنا پڑا کہ :

اپنا ہر اک کام پہلے وقت سے کرتا رہا
اس طرح سے اک تماشا بخت سے کرتا رہا

کیونکہ ارشد محمود ارشد سے جو لوگ ملے یا جنہیں اس سے واسطہ ہے وہ اس حقیقت سے اچھی طرح باخبر ہیں کہ اس نے ہمیشہ وقت سے پہلے اپنا کام نمٹانے کی کوشش کی ہے۔ اس کی شاعری کو پڑھنے والے بھی محسوس کریں گے کہ یہ جوان جذبوں، جوان امنگوں، جوان خواہشوں اور آدرشوں کی شاعری ہے۔ عام طور پر ہم ایسی شاعری کو رومانوی شاعری کہتے ہیں اور اسی لیے مجھے ارشد کو رومانیت کا شاعر کہنا پڑا۔

ارشد محمود ارشد کی شاعری کا نقشِ ثانی

ڈاکٹر شفیق آصف۔۔۔ سرگودھا

ارشد محمود ارشد کی غزلوں اور نظموں کا اولین نقش،، عجب سی بے قراری ہے،، 2007 میں منصۂ شہود پر آیا اور پزیرائی کی منازل طے کیں اور اس کی شاعری کے نقشِ ثانی کی نمود،، کبھی میں یاد آؤں تو۔۔۔۔۔،، کی شکل میں ہوئی ہے۔ جس میں حسب روایت اس کی غزلیں اور نظمیں شامل ہیں اردو لغت میں غزل کے جو معنی دیئے گئے ہیں ہر چند کہ غزل اب اس سے بہت آگے جا چکی ہے تاہم ارشد کی خوبی یہ ہے اس نے غزل کی کلاسیکی روایت میں رہ کر مضامینِ تازہ کی تلاش کی ہے اس حوالے سے ہم ارشد محمود ارشد کو تازہ لہو کے اس قبیلے کا فرد قرار دے سکتے ہیں جس کی شاعری کے رنگ کسی طور بھی پھیکے نہیں پڑیں گے بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں مزید نکھار آئے گا ارشد محمود ارشد کے تازہ شعری مجموعہ ،، کبھی میں یاد آؤں تو۔۔۔۔۔،، میں خواب منظر باطنی احساسات کے ساتھ عکس ریز ہوتے ہیں۔ وہ اپنے عہد کی سماجی صورتِ حال سے بھی بے خبر نہیں ہے ۔یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری میں عصری شعور، تخلیقی تکون ایقان سے بغلگیر ہوتے ہوا دکھائی دیتا ہے۔ارشد نے محبت اور نفرت کے رویوں کو بھی عمیق نظری سے دیکھا اور اپنے حساس دل کے ساتھ محسوس کیا ہے اور ان کا بیان شعری پیرائے میں یوں کیا ہے۔

جو آنکھوں میں امڈ آیا ہے میری
اسی سیلاب سے الجھا ہوا ہوں

اترا ہے آج کیسا یہ سورج زمین پر
ہر شخص کو ہیں جان کے لالے پڑے ہوئے

کس طرح سے اب کروں میں ساحلوں کی آرزو
ہے شکستہ بادباں بھی اور ہوا کوئی نہیں

جس نے میری بینائی کو چھین لیا
وہ تو آج بھی میری آنکھ کا تارا ہے

اس نے پہلے جلایا مرا آشیاں
بعد اس کے وہ خود بھی رہا مضطرب

ارشد محمود ارشد ایک باشعور شاعر ہے اسی لیے اس کے ہاں عصری سچائیاں بکھری ہوئی نظر آتی ہیں وہ اپنی لہو لہو انگلیوں سے محبت کے ترانے لکھتا ہے اور وفاؤں کو شعری پیکر عطا کرتا ہے اس کی شاعری جذبوں سے مالا مال ہے اور اس کے دھنک رنگ اشعار قارئین کو اپنی جانب متوجہ کرتے ہیں۔

کچی نیند سے جاگنے والوں سے پوچھو
ٹوٹے سپنے کتنا بے کل کرتے ہیں
تری تصویر آنکھوں میں رہے گی
زمانے کو گوارا بھی نہیں ہے
چار سو پھیلی ہوئی ہے دھوپ تیرے روپ کی
اور حوالہ بن گیا ہے روشنی کا آفتاب

عصرِ حاضر میں شاعری تھوک کے حساب سے ہو رہی ہے۔ متعدد شاعر شاعری کی جمالیاتی قدروں سے ناواقف نظر آتے ہیں ان کی شاعری،، سٹریوٹائپ،، شکل اختیار کر لیتی ہے ایسے میں ارشد محمود ارشد جیسے نوجوان شاعر جب ادب اور بالخصوص شاعری کی جمالیاتی قدروں کو پیش نظر رکھتے ہیں تو بے حد خوشی ہوتی ہے۔ ارشد محمود ارشد معاشرتی نشیب و فراز کا ذکر بھی شاعرانہ اسلوب میں کرتا ہے اور لفظوں کی کوملتا کو بھی مجروح نہیں ہونے دیتا۔ اس کے علاوہ کلاسیکی تراکیب و مضامین کو نئے ڈکشن کے ساتھ اپنی شاعری کا حصہ بناتا ہے۔ اس کا یہ شعوری رویہ بھی اس کی شاعری کو اور زیادہ خوبصورت بناتا ہے

صحنِ گل میں آتش و آہن کا کھیل
صحنِ گل کا ہر مکیں خطرے میں ہے

روتے روتے آنکھ بھی پتھرا گئی
اک ذرا سا مسکرا کر کیا ملا

"عجب سی بے قراری ہے" سے کبھی میں یاد آؤں تو تک کا سفر ارشد محمود ارشد کے فنی ارتقاء کی کہانی بیان کرتا ہے۔ اس کہانی کے بہت سے منظر ہیں تاہم یہ منظر ہماری اپنی زندگی کے ترجمان ہیں اور یوں ہم ارشد محمود ارشد کو آج کا شاعر قرار دے سکتے ہیں اور کسی دانشور کا قول ہے کہ جس کا آج اچھا ہے اس کا کل بھی شاندار ہوگا اور یوں ہم ارشد محمود ارشد کے شاندار مستقبل کے تمنائی ہیں۔

ادبی اُفق پر اُبھرتا شاعر

محمود اختر خان۔۔کراچی

سرزمینِ سرگودھا ادبی حوالے سے اتنے قد آور حضرات کا مسکن رہا ہے جن کی گونج بر صغیر سے نکل کر عالمی سطح پر سنائی دینے لگی جس میں شکیب جلالی اور ڈاکٹر وزیر آغا نمایاں ہیں۔

اب تو آرام کریں سوچتی آنکھیں میری
رات کا آخری تارا بھی جانے والا ہے

(وزیر آغا)

ہم جنس اگر ملے نہ کوئی آسمان پر
بہتر ہے خاک ڈالئے ایسی اُڑان پر

حق بات آ کر رک سی گئی تھی کبھی شکیب
چھالے پڑے ہوئے ہیں ابھی تک زبان پر

(شکیب جلالی)

دبستانِ سرگودھا کی عظمتوں کو سلام

ایسے سچے، کھرے، اور بڑے لوگوں کے پرورداماحول سے، علمی اور ادبی مہکی فضاؤں سے، ادراک، شعور کے جوہر کشید کر کے ارشد محمود ارشد نے اپنا پہلا شعری مجموعہ،، عجب سی بے قراری ہے،، دیا تین سال بعد پھر ارشد محمود ارشد ایک خوش فکر، باریک بیں، باخبر، عصری کرب کی کسک لئے غزل کے بھرپور تیور لئے،، کبھی میں یاد آؤں تو۔۔۔،، کا خالق بن کر دوبارہ ہمارے درمیاں ہے ذہنوں کو تحریک دینے کا عمل شاعر کو معتبر کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے جس کا ارشد محمود ارشد حق دار ہے۔اشعار کے آئینے میں خوب صورت انداز میں اعتماد کا اظہار، بظاہر جو کچھ ہو رہا ہے اس میں کیا مصلیحت پوشیدہ ہے وہ جانے اتنا یقین ضرور ہے کہ فراموش کرنا اُس کے اختیار میں نہیں کتنے پیارے انداز میں سمجھا رہے ہیں۔

اُٹھا رہے ہو جو یوں اپنے آستاں سے مجھے
نکال کیوں نہیں دیتے ہو داستاں سے مجھے

گمان، آس، اُمید، لگن، تمنا اور چاہت کی ڈور خلافِ توقع اچانک ٹوٹ جائے تو کس اضطراب سے دوچار ہونا پڑتا ہے کچی نیند،، کہہ کر محبوب کی آبرو بچالی اور الزام خود پر لے لیا جو عشق کا اثاثہ ہے۔

کچی نیند سے جاگنے والوں سے پوچھو
ٹوٹے سپنے کتنا بے کل کرتے ہیں

چاہت میں انا کو قربان کرنا محبت کی آبیاری کے لئے لازم و ملزوم ہے۔

نہ جانے ضد ہے یہ کیسی انا میں اور محبت میں
تعلق توڑتا ہے وہ میں تعلق جوڑ رہتا ہوں

غم سے نالاں نہیں، غم سے زندگی کو جلا دینے کا خوگر، غم کی قدر و منزلت کا آشنا، غم کشیدہ، غم کو اساس حیات سمجھتے ہوئے، غم سے زندگی کو آسودہ رمق دینے کی بات کرنا، غم کا احسان مند نظر آنا، کتنے پر اعتماد لہجے میں اعتراف کہ غم شعور کو بیدار کرنے میں مہمیز کا کام کرتا ہے۔

یہ بھی ہے احسان اُس کا دے کے اپنے غم مجھے
سلطنت میری کشادہ کر رہا ہے آج وہ

ارشد محمود ارشد عصرِ حاضر کی ریشہ دوانیوں سے لا علم بھی نہیں اور غافل بھی نہیں۔ وہ انتہائی پُر اُمید ہے اُسے یقین ہے کہ یہ داخلی خلفشار ہی ہمارے لئے سوہانِ روح بنا ہوا ہے اس پر قابو پا کر بیرونی سازشوں سے نجات حاصل کرنے میں ضرور کامیاب ہونگے جس کا خوب صورت اظہار یوں کیا ہے۔

نمٹ لوں گا میں ارشدؔ دشمنوں سے
ابھی احباب سے اُلجھا ہوا ہوں

موجودہ بے راہ روی کا ماحول، جبر و تشدد کی حکمرانی کی داستانیں، ظلم و بربریت کے جاں بلب نظارے، خوں چکاں حکایتیں، دل دہلا دینے والی داستاں، شاعر کو کبیدہ خاطر کئے ہوئے ہیں لیکن وہ نہ اُمید نہیں ہے اس کوشش میں سر گرداں ہے اس عذاب سے نجات کے لئے روشن پہلو کی تلاش میں اس طرح عرق ہے کہ

اس تیرگی کے راج کو توڑیں تو کس طرح
اس سوچ میں ہیں کب سے اُجالے پڑے ہوئے

معاشرہ اس قدر پراگندہ ماحول کے حصار میں آچکا ہے کہ سسکتی ہوئی انسانیت پر شاعر ماتم زدہ بھی ہے اور خوف زدہ بھی، موجودہ صورتِ حال کے پیشِ نظر دور دور کوئی امید کی روشن کرن محسوس نہیں ہو رہی بلکہ بگاڑ وبا کی وہ صورت اختیار کرتا جارہا ہے کسی کا بھی محفوظ رہنا مشکل نظر آرہا ہے۔

خوف طاری ہے کہیں اس بھیڑ میں کھو جاؤں نا
سب کے چہرے ایک جیسے ہیں جدا کوئی نہیں

کسی بھی دور کی شاعری گرد و پیش کی عکاسی کے بغیر مکمل ہی نہیں ہوتی پھر یہ کیسے ممکن کہ ارشد محمود ارشد خاموش رہے۔ کہیں مصلیحت، کہیں مجبوری، کہیں ضرورت، ندامت اور نقاہت کے انبار تلے سسکیاں سنائی دے رہی ہیں لیکن شاعر پر عزم ہے اُس کے یہاں پیغام بیداری، سر اُٹھا کر جینے کا احساس، سرنگوں زندگی کا خاتمہ مجبور محض طرز کے خلاف اعلانِ جنگ انتہائی واضح انداز میں ہے۔

کسی محتاج کو جیسے ضرورت مار دیتی ہے
انا کے ٹوٹ جانے سے ندامت مار دیتی ہے
رہوں یا نہ رہوں رسموں کی زنجیروں کو توڑوں گا
پتہ ہے یہ قبیلے سے بغاوت مار دیتی ہے

ماحول کی درستی کا جنوں وہ جو سر چڑھ کر بولے، سر کا سودا کرنے سے بھی اجتناب نہیں، بہتری کی اُمید بر حق آخری دم تک

رفتہ رفتہ ان اندھیروں میں ضیائیں بانٹ کر
ڈوب ہی جائے گا میری زندگی کا آفتاب

احساس سے لبریز نظمیں،، کبھی میں یاد آؤں تو۔۔۔،، بے خبر، التجا، بے بسی، اور بہت سی توجہ خاص کی طالب ہیں۔
ارشد محمود ارشد کی شاعری میری دانست میں ایک نئ مگر دیدہ زیب کونپل کی مانند ہے مگر وہ دن دور نہیں جب ارشد محمود ارشد کی شاعری ایک تناور سایہ دار شجر کی شکل اختیار کرے گی بشرطِ کے اپنا ادبی سفر اسی سنجیدگی اور ذوق و شوق سے قائم رکھیں۔

عجب سی بے قراری ہے

کنیز بتول کھوکھر

ادب سے میرا لگاؤ بہت پرانا ہے مجھے جہاں بھی کوئی اچھا ادبی فن پارہ ملتا ہے اسے ضرور پڑھتی ہوں ایک بار کچھ ادبی مواد خریدنے بازار گئی تو اتفاق سے میری نظر ایک کتاب پہ پڑی جس کے نام،، عجب سی بے قراری ہے،، نے میرے اندر تجسس پیدا کیا۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ نفسیات میرا پسندیدہ مضمون ہے نفسیات پڑھ پڑھ کر یہ احساس پیدا ہو گیا ہے کہ انسان جیسا دکھائی دیتا ہے ویسا ہوتا نہیں بلکہ اس کے اندر کہیں چھپا ہوتا ہے جسے ڈھونڈنا پڑتا ہے اور کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو خود کو خود سے بھی چھپا کر رکھتے ہیں مجھے لگا کہ ارشد محمود ارشد کا تعلق بھی انہیں لوگوں سے ہے جس کو اپنی کیفیت کی بھی خاص سمجھ نہیں آ رہی۔ یہ جاننے کے لیے کہ اس بے قراری کا سبب کیا ہے کتاب خرید لی گھر آکر جب مطالعہ کیا تو حمد کے اس شعر نے۔

ناتا جس نے تجھ سے جوڑا منزلیں وہ پا گیا
کیوں بھٹکتا پھر رہا ہے پھر ہمارا کارواں

مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اگر دیکھا جائے تو آج پوری دنیا میں مسلمان رسوا ہو رہے ہیں جبکہ اللہ سے ربط رکھنے والوں کا ہر کام آسان ہو جاتا ہے کیونکہ ان کے ساتھ امدادِ غائبی ہوتی ہے کہیں ایسا تو نہیں کہ ہمارا ناتا کہیں سے ٹوٹ چکا ہو اور ہمیں خبر تک نہیں۔ اب یہ بے قراری صرف ارشد کی نہیں بلکہ ہر پڑھنے والے کے اندر یہ سوال اٹھتا ہے کہ ہمیں اپنی ذات کا احتساب کرنا چاہئیے خرابی کہاں ہے احساس کے جھروکوں سے کئی سوال ابھرنے لگے ایسی کیفیت لے کر نعتِ رسولؐ شروع کی تو آخری شعر نے جھنجھوڑ دیا

جو بھی آقاؐ نے رستہ دکھایا ہمیں رب تلک پہنچنے کا وسیلہ بنا
جو بھی آقاؐ کے اسوہ پہ چلتا رہا، چلتے چلتے اسے بھی خدا مل گیا

ہم کس راستے پر چل رہے ہیں اور ہمیں کیا بتایا گیا پھر سے ایک سوالیہ نشان۔۔۔۔ کیا یہ رستہ منزل کی طرف جاتا ہے ؟ اگر نہیں جاتا تو پھر ہم کیوں اس پر چل رہے ہیں اس کا خمیازہ کون بھگتے گا اگر انسان اس کا جواب تلاش کر لے تو عقل کی معراج تک پہنچ جائے۔

اللہ اور اس کے رسول کے بعد جس ہستی کا انسان پر سب سے زیادہ حق ہے ارشد محمود ارشد اس ترتیب کو بھی نہیں بھولے کتنی خوبصورتی کے ساتھ محبت کا آغاز بے لوث محبت سے کیا ہے

قدموں تلے ہے ماں کے جنت یہ جانتا ہوں
اب ماں ہی جب نہیں ہے جنت کہاں ملے گی

ارشد محمود ارشد تو یہ سوچ رہے ہیں کہ جنت کہاں تلاش کروں لیکن ان لوگوں کے لیے لمحۂ فکریہ ہے جن کی مائیں حیات ہوتی ہیں اور وہ پھر بھی جنت کہیں اور تلاش کر رہے ہیں۔

نظم ،، عجب سی بے قراری ہے ،، بھی خاصے کی چیز ہے احساس کی شدت کو ناپنے کا کوئی آلہ نہیں یہ صرف وہی جانتا ہے جس پر گزرتی ہے اس چوٹ پر کوئی مرہم کارگر نہیں اس وقت ارشد کی حالت کچھ ایسی محسوس ہوتی ہے جیسے ساحل سمندر پر کھڑے شخص کو بے رحم موجیں اپنے ساتھ بہا کر لے جائیں اور کسی دوسرے ساحل پر جا کر پٹخ دیں اور وہ بے بسی کی تصویر بنا دیکھتا رہے۔

لگا کر قہقہے ہنستا ہے اکثر بزمِ یاراں میں
اسے معلوم ہے تنہائی میں گھٹ گھٹ کے رونا ہے

غم چھپا کے مسکرانے کا فن ارشد کو خوب آتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہاں لوگ غم کا مداوا نہیں کرتے تماشا دیکھتے ہیں اس لیے بہتر ہے کہ اپنے غم کو خود سے بھی چھپا کر رکھا جائے۔

کہا اس نے کہ ارشد زندگی اب کیسی لگتی ہے
کہا میں نے خزاں کی جس طرح اک شام ہوتی ہے

یہ دنیا دل لگانے کی جگہ نہیں بلکہ عمل کی جگہ ہے لوگ اس زندگی کو سب کچھ سمجھ لیتے ہیں ان کے برعکس ارشد اس قلندر کی طرح دکھائی دیتا ہے جس کا دل دنیا کی محبت سے خالی ہو یہ کیفیت دنیاوی غرور رفعت سے بھرپور حسرت وندامت سے بہتر ہے۔

کہا میں نے کوئی مرتا نہیں کیوں اب محبت میں
کہا اس نے کہ ہر رانجھا یہاں ہر ہیر جھوٹی ہے

ارشادِ باری ہے جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کرتے رہے اللہ تعالیٰ ان کی محبت لوگوں کے دلوں میں ڈال دے گا۔ سورۃ مریم،، یہ ہے اصل محبت کا معیار جس کی بنیاد نیکی ہے،،

محبت اللہ کے قرب کا دوسرا نام ہے عشق مجازی، عشق حقیقی کی پہلی سیڑھی ہے محبت انسان کی ذات میں ٹھہراؤ پیدا کرتی ہے یہ ٹھہراؤ قوتِ برداشت کو بڑھاتا ہے اور برداشت اپنے نفس کو کنٹرول میں رکھنا سکھاتی ہے اور جب نفس اپنے قابو میں آجائے تو پھر اس کا رابطہ اللہ سے جڑ جاتا ہے ارشد محمود ارشد کی بے قراری بلاوجہ نہیں۔ معاشرے میں نشیب و فراز، قول وفعل میں تضاد، لہجوں کی تلخی یہ سب کچھ ایک نرم دل اور عقل و شعور رکھنے والے انسان کو بے قرار کرنے کے لیے کافی ہیں اگر ہر انسان اس زاویے سے سوچنے لگے تو ہم اپنے معاشرے کو مثالی بنا سکتے ہیں۔ میری بہت سی دعائیں ارشد محمود ارشد کے لیے کہ اللہ کرے اس کی بے قراری قائم رہے اور ادبی فن پارے تخلیق ہوتے رہیں۔ آمین

بساطِ زیست میری نظر میں

عرفان خانی۔۔چکوال

زندگی کا سفر نہیں رکتا
چھوڑ جاتے ہیں بھائی رستے میں

اس خوبصورت اور سچے شعر کے خالق ارشد محمود ارشد کا تعلق سرگودھا سے ہے۔جہاں ادبی نگینوں نے ادب کی انگوٹھی کو نسل در نسل نشانی ووراثت کے طور پر آج بھی نمایاں کر کے کانس پر سجایا ہوا ہے۔ارشد محمود ارشد کا''بساط زیست '' کے نام سے تازہ شعری مجموعہ ہے جو کہ ادارہ حرف اکادمی پاکستان نے شائع کیا ہے۔اس مجموعہ میں غزل و نظم پر تخیل کی کشیدہ کاری کے بولتے الفاظ کا بہترین مزاج انتہائی سادہ سلیس زبان میں کیا گیا ہے۔اپنی ذات کا دکھ،دوسروں کے دکھ سے جڑا ہوا دکھائی دیتا ہے۔جمالیات کا بھی ایک خوبصورت منظر نمایاں ہے۔محبوب کی چاہت،جدائی کے غم،کے ساتھ عشق حقیقی کی بھی جھلک سے مزین یہ مجموعہ قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے،بہت ایسے اشعار بھی موجود ہیں جو نئی تشبیہ، استعارے،تلمیحات کے ساتھ اس مجموعہ کو منفرد بناتے ہیں۔جہاں شعری اسلوب پختہ ہے وہیں پر کچھ تخیل بھی عمدہ پرواز کا آئینہ دار ہے۔حبس کا خیال ہو یا پرندوں کی ہجرت کا مقالمہ۔گھر کے بٹوارے کی بات ہو یا پنجرا اس کی چیخ،یا زمانے دکھ،سیلاب کا وقوع ہو یا،دہشت کا خوف،عاجزی ہو یا انکساری کی تبلیغ،نفرت کا بوجھ ہو یا محبت کی فراوانی،وہ سب اہ پکار،خوشی،جیسے موضوعات،،،بساط زیست،،جیسے مجموعہ کی زینت ہیں چند اشعار اپکے ذوق سخن کی نذر۔

یا نئی یا نئی سُر نکلتے رہیں
میرے ہونٹوں کو وہ بانسری چاہیے

بنانے والے نے سوچا یہ دل بناتے ہوئے
کہیں تو اپنے بھی رہنے کا انتظام ہوا

ماسوا عشق کے ہر چیز فانی ہوتی ہے
یہ مگر عالمِ فانی میں کہاں سے آیا

اس لئے ایک ہی محبت کی
ایک ہی دل تھا یار سینے میں

اس لئے سر پہ اٹھا یا ہے یہ غم کا سورج
دھوپ پڑتی ہے تو پیڑوں پہ ثمر آتا ہے

ان اشعار کے ساتھ خوبصورت مجموعہ کی اشاعت پر مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعا گوہوں کہ زور قلم اور زیادہ

ارشد محمود ارشد کی شاعری میں ایک چیز کی کمی ہے

(بساطِ زیست سے انتخاب) نوید ملک۔۔۔راولپنڈی

ارشد محمود ارشد سے میری شاید ایک ہی ملاقات ہے مگر ہماری دوستی کئی سالوں سے فیس بک پر ہے۔ان کی شاعری نظر سے گزرتی رہتی ہے۔ان کا تازہ شعری مجموعہ بساطِ زیست حال ہی میں شائع ہوا اور تحفتاً مجھے بھیجا۔ مجھے ان کی شاعری میں ایک چیز کی کمی نظر آئی جو عموماً کچھ شعرا کے ہاں کم اور کچھ کے ہاں زیادہ نظر آتی ہے۔ایک موضوع آج کل زیرِ بحث ہے کہ معاشرہ شاعر کو کیا دیتا ہے۔ مگر سوچنے کی بات یہ بھی ہے کہ شاعر معاشرے کو کیا دے رہا ہے۔

"شیلے "کے نزدیک شاعری مسرت بھرے بہترین دلوں اور دماغوں کے بہترین لمحوں کی روداد ہے۔تواتر سے لکھنے والے تخلیق کار ادبی اقدار کو پروان چڑھاتے ہیں۔ تسلسل سے بہتے ہوئے وہ اس بات سے نابلد ہوتے ہیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور اس کے کیا اثرات رونما ہو سکتے ہیں۔

پہلے بساطِ زیست سے کچھ اشعار

اس نے کہا خزاؤں میں کھلتے نہیں گلاب
میں نے کہا کہ آپ ذرا مسکرایئے

لٹنے والوں کی بات رہنے دے
میں نے پوچھا ہے راستہ مرے دوست

دن بدلتے نہیں ہیں رونے سے
حوصلہ دیکھ! حوصلہ مرے دوست

بنا گھنگرو، تمہارے آستاں پر
کسی بے کس کی حاجت ناچتی ہے

تمہاری تشنگی دیکھی نہیں گئی مجھ سے
میں اپنی اوک میں دریا اٹھا کے لایا ہوں

اس کا وعدہ ہے رزق دینے کا
بھوکے سوتے ہیں کب پرندے بھی

دل سے نکلی تو عرش چھو لے گی
لب پہ ٹھہری دعا، تماشا ہے

اس زمیں کو چھوڑ کر چاہے چلا جا چاند پر
آسماں سر پر رہے گا ، زیرِ پا ہوتا نہیں

اجنبی دیس میں مسافر کا
مسئلہ بے مکاں سمجھتے ہیں

دعائے ابر بھی مانگی نہیں گئی مجھ سے
کہ میری جھونپڑی اس بار گرنے والی ہے

رومانی رنگ ان کی شاعری میں گہرا ہے۔سماجی حوالے بھی ان کے فن پاروں میں موجود ہیں۔ان کی شاعری میں اگر کمی ہے تو مایوسی کی۔ان نے شکوہ ضرور کیا مگر شاعری کو اندرونی کیفیات کا نام دے کر قارئین پر مایوسی انڈیلنے کی کوشش نہیں کی۔ان کا یہ شعری رویہ دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ہمارا عہد شعراء اور دیگر اصناف میں لکھنے والوں سے امید اور راستہ مانگتا ہے نہ کہ ابھرتے ہوئے مسائل کی گود میں پلنے والی یاسیت۔بہت اندھیرا ہو چکا ہے۔اب چراغ روشن کرنے والوں کی ضرورت ہے۔مجموعی طور پر بساطِ زیست عمدہ کاوش ہے جس پر میں انھیں مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ان کے ایک شعر کے ساتھ ایک دعا

ہر ایک موسم میں لہلہانے کی ٹھان لی ہے
گلوں نے صرصر کا دل جلانے کی ٹھان لی ہے

میری دعا ہے کہ آپ ہمیشہ لہلہاتے رہیں۔۔سدا خوش رہیں۔۔آمین

دم ساز

ارشد ملک اسسٹنٹ ڈائریکٹر پبلی کیشنز یونیورسٹی آف سرگودھا

چناب اور جہلم کے درمیان کی زمینیں عجیب و غریب صلاحیتوں کی زمینیں ہیں کہ ان کے اندر کی آنچ میں گندم، گنوں اور محسوسات کی فصلیں ایک جیسی توانائی کے ساتھ اگتی اور پھلتی پھولتی ہیں یہاں کی گندم میں خصوصی دمک ہوتی ہے، یہاں کے گنوں میں ایک البیلی چمک ہوتی ہے اور یہاں کے باسیوں میں محسوسات کی دنیاانوکھی اور پرت در پرت جذبوں سے بُنی ہوئی ہوتی ہے احساس و جذبہ زمین کے مساموں میں سفر کرتا ہوا یہاں کے باسیوں کے مزاجوں میں منتقل ہوتا ہے۔ تو علوم و فنون کی کار گہیں چلتی ہیں، شعور و فکر کے دیے روشن ہوتے ہیں۔ جذبہ و احساس کے تار جھنجھناتے اور سروں میں ڈھلتے ہیں۔

ارشد محمود ارشد بھی اسی دیس کا جھنجھنایا ہوا ساز ہے جو شعر و نغمہ میں ڈھلتا ہے تو بھلا لگتا ہے کہ اس کا تخلیقی سفر سماجی اور ثقافتی فنی سروں پر محیط ہے۔ ارشد کی شاعری میں اظہار وابلاغ قدرتی ہے، فکر و خیال جن ارتقائی منازل سے گزرا ہے، وہ فطری ہیں رومانیت کے ساتھ منفرد و تخلیقی صلاحیت اس کے ہاں مالک کی دین ہے مگر ان کا مطالعاتی اور مشاہداتی تسلسل سراسر اپنا اور سراسر انفرادی ہے جو دلگداز بھی ہے اور دلفریب بھی۔۔۔ فن پر گرفت کے ساتھ اس کا خوبصورت مترنم اندازمزہ دیتا ہے۔

اسے میں رازداں کرنے لگا تھا
لپیٹ کے رو پڑی دیور مجھ سے
زندگی آپ سکھاتی ہے قرینے سارے
زخم ملتے ہیں تو جینے کا ہنر آتا ہے

ارشد محمود ارشد کے ہاں سلیقہ اظہار طرح دیتا اور کاروبار دنیا کی تپش اور سلگن میں ایک ٹھنڈی میٹھی شعری فضا قائم کرتا چلا جاتا ہے پھر اس شعری فضا میں ان کا سوچتا ہوا اظہار فکر، شعور انسانی پر اپنے اثرات مرتسم کرتا ہے۔ سلگتی ہوئی دھوپ چھاؤں میں اس مخصوص شعری فضا کی چھتری اپنی ذمہ داری نبھاتی اور ٹھنڈ کیں فراہم کرتی چلی جاتی ہے۔

بوڑھے پیڑ کی چھاؤں کیسے بانٹو گے
آنگن میں دیوار اٹھانا ٹھیک نہیں
الجھ کر راستے میں سوچتا ہوں
کوئی دمساز ہونا چاہیے تھا

کوئی تو سانحہ گزرا ہے اس پرندے پر
کہ آدھی رات کو جو گھونسلے سے باہر ہے

ارشد محمود ارشد کے اشعار کے مضامین تفکر آمیز بھی ہیں اور بہجت آفرین بھی۔ ان کی غزلوں میں دل پر گزرنے والی کیفیات اپنے اظہار کے تسلسل میں کیف و کم کا خلوص کیش مجموعہ ہے۔ انھوں نے بجا طور پر غزل میں نوجوان شعرا کی نمائندگی کی ہے۔ اپنے پورے تہذیبی رچاؤ کے ساتھ ان کے پاس محبتوں کی کسک بھی ہے، جذبے کی آنچ بھی اور خیال کی پرواز بھی۔ خالصتاً انسانی رشتوں کے باہمی تعلق، محبت و مروت کے مناظر اور رنگ و آہنگ کی دنیا ان کی شعری فضا کو خوشبودار کرتی اور مشام جاں معطر کرتی چلی جاتی ہے۔ ان کا تخلیقی وفور قابل ذکر اس لیے بھی ہے کہ یہ فکری رجحان معاشرتی خمیر سے توانائی حاصل کرتا ہے اور شعری فضا ترنم ریز ہو جاتی ہے ان کی شعری دنیا کے معنی و مفاہیم مقامی تہذیبی زندگی سے متعین ہوتے ہیں۔

بینائی کا فیصلہ ہونے والا ہے
میں نے اک سورج سے آنکھ ملا لی ہے

یہ مٹی پاؤں مرے چھوڑتی نہیں ورنہ
فلک کا راستہ بھی سامنے پڑا ہوا ہے

ارشد کی پرواز اپنا ابتدائیہ ختم کر چکی ہے اور ابھی کھلی فضاؤں میں اسے دور تک جانا ہے مجھے یقین ہے کہ ان کا شعری سفر اپنی اڑانوں کی تکمیل پر دور دراز کے قصے اور داستانیں بھی اپنے ساتھ لائے گا اور داستان گوئی وہیں سے شروع ہو گی جو چناب اور جہلم کے عین وسط کی اس سرزمین کا ورثہ ہے۔ وہ اپنی تہذیب میں اپنا جہان معنی پیدا ہی نہیں کریں گے، اس کی ترسیل بھی کریں گے۔

دستِ قضا بڑھا ہے مری سمت الوداع
اے اعتکاف عشق عبادت تمام شُد

وہ اپنے شعری سفر میں ظفر مند ہیں اور میری دعا ہے کہ اللہ رب العزت انھیں مزید کامرانیاں عطا فرمائے۔ آمین

بساطِ زیست

پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم۔۔ سرگودھا

ارشد محمود ارشد کی شخصیت شعری رویوں کی آکاس بیل ہے۔ وہ آکاس بیل کی طرح خلوص کی صورت پھیلا ہوا ہے۔ جب سمیٹتا ہے تو آپ کے ہاتھ چوم کر اپنی ذات کو توانا کرتا ہے۔ ارشد محمود ارشد کا دوسرا نام محبت ہے۔ احترام اور شخصیت اس کی ذات کے طرۂ امتیاز ہیں۔ وہ خلوص کا تاج محل تعمیر کرتا ہے لیکن کسی غریب کے جھونپڑے کا مذاق نہیں اُڑاتا۔ اس نے دھیمے لہجے کی شاعری کی ہے۔ وہ خود اس درخت کی مانند زندگی گزارتا ہے جو دھوپ میں جلتے ہوئے دوسروں کو سائباں مہیا کرتا ہے۔ اس کے وجدان میں محبت واخوت اور رنگ وآہنگ کا ایک جہاں آباد ہے۔ اس نے حُسنِ معنی کا ایک جہاں آباد کر رکھا ہے وہ انسانوں سے پیار کرنے کے ساتھ ساتھ پھولوں، درختوں اور پرندوں سے بھی اظہارِ محبت کرتا ہے۔ اسے اردو شاعری کی کلاسیکی روایات کا بھرپور ادراک ہے لیکن جدید شعری رویوں سے بھی بخوبی آگاہ ہے۔ اس نے جدیدیت کے تیشے سے لفظوں کی قربان گاہ پر جذبات کا قتل نہیں کیا۔ ارشد محمود ارشد نے نہایت لطیف جذبوں سے اپنے سچ کو نذرِ قرطاس کیا ہے۔ ارشد نے بہت کم عرصہ میں اپنا ادبی قد بلند کیا ہے۔ اسے ذوالفقار احسن، عابد خورشید، عاشر وکیل راؤ اور ایسے ہی کئی نوجوانوں کی محافل میں غزلیاتی معرکے سر کرتے دیکھا ہے۔ مختلف حوالوں سے ارشد محمود ارشد کے بارے پتہ چلا ہے کہ وہ ۹۶ جنوبی سرگودھا میں یکم فروری ۱۹۷۵ کو اللہ دتہ کے ہاں پیدا ہوئے۔ اس اعتبار سے وہ عمر میں مجھ سے بیس سال چھوٹے ہیں۔ ابتدائی تعلیم ندیم اکیڈمی سٹلائٹ ٹاؤن اور ایم۔ سی ہائی سکول بلاک اے سٹلائٹ ٹاؤن سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ مزید تعلیم کے لیے گورنمنٹ کالج چک ۸۸ جنوبی میں داخل تو ہوئے لیکن انٹر میں انٹر ہونے سے محرومی رہی۔ الحسیب ہومیوپیتھک کالج سے ڈی ایچ ایم ایس کی ڈگری حاصل کی۔ طویل تعطل کے بعد تعلیمی سلسلے کو دوبارہ بحال کیا اور ۲۰۱۶ میں ایف اے اور ۲۰۱۸ میں بی اے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے کیا اور اب ایم اے اردو کر رہا ہے۔ اس کا شعری سفر ۱۹۹۱ء میں شروع ہوا اور تادمِ تحریر وہ لفظوں کے گجرے پرو رہا ہے۔

"بساطِ زیست" سے پہلے اس کے تین شعری مجموعے " عجب سی بے قراری ہے" (۲۰۰۷ء)" کبھی میں یاد آؤں تو۔۔۔(۲۰۰۹ء)" "شام کی دہلیز پر" (۲۰۱۴ء) منظر عام پر آ چکے ہیں۔ علاوہ ازیں اس نے شعر وسخن کی چار کتابیں بھی مرتب کی ہیں۔ جن کے نام" محبت بانٹ لیتے ہیں "" نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قصیدہ "" تمہاری یاد کا موسم" اور کوئی تعبیر دو مجھ کو" ہیں۔

ارشد محمود ارشد کی شخصیت کا ٹھہراؤ اس کی شاعری میں خوب جھلکتا ہے۔" بساطِ زیست " کی غزلوں اور دس نظموں کے مطالعہ سے قاری اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس کے شعری سفر میں نئے

مشاہدات اور تجربات سامنے آ رہے ہیں۔ سیما غزل نے تبصرہ کرتے ہوئے ارشد محمود ارشد کے اشعار میں بکھری ہوئی مایوسی کا تذکرہ کرنے کے ساتھ ساتھ ایک اچھی بات لکھی ہے :

یہ یقین، یہ بھرپور امید اور یہ بے نیازی اور خود اعتمادی، تکمیل کی طرف پہلا قدم ہے اور ایسی ہی بہت سی امیدیں ارشد محمود ارشد کی شاعری میں موجود ہیں۔ مجھے اطمینان ہوا کہ میں کسی بے سمت، اُلجھے اور کنفیوزڈ شخص کو نہیں پڑھ رہی، بل کہ ایک ایسے شخص کو پڑھ رہی ہوں جو نہ صرف پُر اُمید ہے بل کہ اپنے قاری کو امید کی چنگاریاں ہی سہی۔۔۔ مگر بانٹ تو رہا ہے۔

ارشد محمود ارشد کے لفظوں کی چنگاریاں اس امید پر سلگ رہی ہیں کہ کبھی آگ بھڑکے گی اور کبھی تو روشنی ہو گی۔ اس کلام کا یہ تسلسل کچھوے کی چال ضرور ہے لیکن منزل تک پہنچنے کی سکت رکھتا ہے۔

معروف شاعر قمر رضا شہزاد نے ارشد محمود ارشد کی شاعری کو بہت خوبصورت عنوان سے نوازا ہے۔ درختوں اور پرندوں سے ہمکلام شاعر، وہ اس ضمن میں رقم طراز ہیں:

ارشد محمود ارشد نے اپنی غزل کا خمیر عہد حاضر کی صورتِ حال اور اپنے اندرون کی دنیا سے جنم لینے والی ایسی کیفیات سے اٹھایا ہے جو ہر پڑھنے والے کو اپنی محسوس ہوتی ہیں۔ عمدہ شاعری کا کمال بھی یہی ہے کہ وہ شاعر اور قاری کے مابین فاصلوں کو ختم کر دیتی ہے اور جب یہ فاصلے ختم ہو جاتے ہیں تو پھر شعر کا قاری شاعر کی دنیا کا حصہ بن جاتا ہے مرے خیال میں یہی وہ بنیادی بات ہے جو کسی شاعر کے کلام کو قبول عام کا درجہ دیتی ہے۔ اور یہ سارے کا سارا عمل شعوری سطح پر شاید اس لیے بھی ممکن نہیں کہ جینوئن شاعر سب سے پہلے اپنی ترجیحات کا تابع ہوتا ہے وہ صرف اور صرف انہی معاملات یا واردات کو اپنی شاعری میں اتارتا ہے جو وہ محسوس کرتا ہے اور جو شاعر ایسا کرنے پر قادر نہیں وہ محض مصرعے تو وزن میں کر سکتا ہے لیکن ان میں وہ شعری روح نہیں پھونک سکتا جو کسی شعر کو زندگی بخش سکتی ہو۔ یہی وجہ ہے ہمارے ہاں مردہ شاعری کے ڈھیر لگے ہوتے ہیں اور جنہیں وقت وقتاً فوقتاً سپردِ خاک کرتا رہتا ہے۔

ارشد محمود ارشد نے اپنے لفظ قاری کے سامنے اس انداز بکھیرے ہیں کہ قاری انھیں اپنی محسوسات سمجھ کر ان میں گم ہو جاتا ہے اس کے ہاں زندگی چلتی پھرتی کہانی کی صورت محسوس ہوتی ہے۔ ارشد کا کرب اس کے لفظ محبت کی عدالت میں پیش کرتے ہیں۔ وہ اپنی محرومیوں کا خود ہی جج ہے اور اپنے فیصلے پر احتجاج بھی نہیں کرتا۔ جدید غزل کے معروف شاعر ارشد ملک نے اپنے ہم نام ارشد کی شاعری پر بڑی خوبصورت رائے دی ہے۔

ارشد محمود ارشد کے اشعار کے مضامین تفکر آمیز بھی ہیں اور بہجت آفرین بھی۔ ان کی غزلوں میں دل پر گزرنے والی کیفیات اپنے اظہار کے تسلسل میں کیف و کم کا خلوص کیش مجموعہ ہے۔ انھوں نے بجا طور پر غزل میں نوجوان شعرا کی نمائندگی کی ہے۔ اپنے پورے تہذیبی رچاؤ کے ساتھ ان کے پاس

محبتوں کی کسک بھی ہے جذبے کی آنچ بھی اور خیال کی پرواز بھی۔ خالصتاً انسانی رشتوں کے باہمی تعلق، محبت و مروت کے مناظر اور رنگ و آہنگ کی دنیا ان کی شعری فضا کو خوشبو دار کرتی ہے۔ اور مشام جاں معطر کرتی چلی جاتی ہے۔ ان کا تخلیقی وفور قابل ذکر اس لیے بھی ہے کہ یہ فکری رجحان معاشرتی خمیر سے توانائی حاصل کرتا ہے اور شعری فضا ترنم ریز ہو جاتی ہے۔

ارشد محمود ارشد نے صنوبر کی طرح باغ میں آزادی کے ساتھ جھومنے کا فن سیکھ لیا ہے لیکن وہ اپنی روایات سے پابہ گل رہتا ہے۔ اس کی کائنات لفظوں میں گھری ہے لیکن آزادی میں اپنی روایات کی پابندی کا خاص خیال رکھتا ہے۔ معروف دانش ور ڈاکٹر شفیق آصف نے مرکز سے دوری کا گلہ کرتے ہوئے ارشد کی شاعری کو سراہتے ہوئے کہا ہے:

کسی فن کار کی بقاء کا انحصار اس کی تخلیقات کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ ارشد محمود ارشد بھی اس جتن میں ہے کہ اس کے لفظ معتبر ہو جائیں، اس مقصد کے حصول کے لیے وہ پوری دیانت داری سے اپنا شعری سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔ ارشد کا تازہ مجموعہ کلام " بساط زیست " اس کا چوتھا پڑاؤ ہے، جسے پڑھ کر یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ وہ اپنی منزل کے قریب تر ہوتا جا رہا ہے معاصر شعری ادب میں ارشد محمود ارشد ان نوجوانوں کی نمائندگی کرتا ہے جو اپنی صلاحیتوں پر اعتماد رکھتے ہیں۔ ان کا یہ اعتماد شعری ایقان کی صورت میں ان کے اشعار سے مترشح ہو رہا ہے۔

ارشد محمود ارشد کی غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جو پڑھنے والوں کو ان کی سحر انگیزی سے متاثر کرتے ہیں۔:

گھنے درخت کے سائے میں جب قیام ہوا
میں پہلی بار پرندوں سے ہمکلام ہوا

فلک سے یونہی تو ہم خاک پر نہیں آئے
ہمارے واسطے کیا کیا نہ اہتمام ہوا

جمالِ یار اگر بدگماں نہیں ہوتا
ذرا سا فاصلہ بھی درمیاں نہیں ہوتا

جدائی چاٹتی رہتی ہے جسم و جاں ارشد
یہ ایسی آگ ہے جس کا دھواں نہیں ہوتا

ملتان سے تعلق رکھنے والی شعر و سخن کی دنیا میں مقبول ترین خاتون صائمہ نورین بخاری نے دبستان سرگودھا میں ارشد محمود ارشد کی حیثیت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:
ارشد محمود ارشد نے چھبروں کی دنیا میں پذیرائی کی محفل سجائی ہے اور ملک کے کونے کونے سے شعراء کی پذیرائی اور حوصلہ افزائی کا سلسلہ جاری ہے۔ وہ تخلیقی سچائی اور اس کی پذیرائی کی خوبصورت کیفیت کو اولین سرمایہ قرار دیتے ہوئے فکر انگیز علامتوں میں اپنی زیست کی شعری خوش رنگی بڑھا رہے ہیں۔ اور ان کی فکر انگیز علامتوں میں ژولیدگی نہیں ہے تصنع اور کوئی شعوری الجھن بھی نمایاں نہیں۔
سرگودھا کی ادبی محافل میں ارشد محمود ارشد کو غزل سرائی کرتے سنا ہے۔ اس کا لہجہ اس کی شخصیت پر پورا اترتا ہے۔ انھوں نے " بساطِ زیست " کے بارے میں چند خوبصورت لفظ نذر قارئین کیے ہیں:
دنیا میرے نزدیک ایک تماشائے حیرت ہے میں اسے اپنی نظر سے دیکھنے کا خواہاں ہوں اور اسے اپنے زاویے سوچنے کا تمنائی۔۔۔ میں اپنی منہ زور سوچوں کو لفظوں کی زنجیروں میں جکڑنے کی بھرپور کوشش کرتا ہوں مگر یہ ضروری نہیں کہ میں ہر بار پر حاوی آسکوں کبھی کبھی وہ لفظوں کی ڈور میں ادبی فن پارے میں ڈھل جاتی ہیں اور کبھی بغاوت کر کے میری بے قراری میں مزید اضافے کا موجب بنتی ہیں۔ جب سے لفظوں سے کھیلنے کا ہنر آیا ہے یہ کھیل ایسے ہی جاری ہے اور یہ بساط تب تک بچھی رہے گی جب تک سانسوں کی ہوت باقی ہے۔
حرف اکادمی کے چیئر مین کرنل (ر) سید مقبول حسین کی رائے کتاب کے بیک ٹائٹل پر بہار دکھا رہی ہے، ملاحظہ ہو:
"شاعری خیالات واحساسات کا آئینہ ہے ارشد محمود ارشد کے کئی شاعری مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں مضامینِ فطرت، عہد حاضر کے مسائل، جدید غزل کی طرف سفر اور دل فریب رچاؤ اس کی شاعری کے خصوصی رنگ ہیں وہ اپنی ذات کی تکمیل شاعری میں کرنا چاہتا ہے وہ دن دور نہیں جب کامیابی اس کے قدم چومے گی۔"
پاکستان میں ۲۰۱۹ء سے کلین گرین پاکستان کی مہم جاری ہے۔ بساطِ زیست کے متعدد اشعار نہ صرف من کی صفائی کی دعوت دیتے ہیں وہاں درختوں سے محبت کا پیغام بھی پہنچاتے ہیں۔

بساطِ زیست": چند تاثرات

ڈاکٹر عبدالعزیز ملک (اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد)

جواں جذبے، لطیف احساس اور تازہ فکر سے مملو ارشد محمود ارشد کا تعلق سر زمینِ سرگودھا سے ہے۔وہ گذشتہ ڈیڑھ دہائی سے تخلیقی سفر پر گامزن ہے۔اس دوران میں اس نے "عجب سی بے قراری"، "کبھی میں یاد آؤں" "شام کی دہلیز پر" اور "بساطِ زیست" جیسے سنگِ میل عبور کیے ہیں۔اس کی شخصیت خلوص و محبت کے پاکیزہ جذبوں کی عکاس ہے۔اس کی ذات نفرتوں اور کینہ پروری کے خلاف ایک مضبوط ڈھال ہے جو منفی جذبوں کو مفتوح رکھتی ہے اور خود کسی عظیم فاتح کی طرح محبت کے لازوال جذبے کی سرحدوں کو وسیع سے وسیع تر کرنے میں مگن رہتی ہے۔وہ انسانوں سے محبت کرنا جانتا ہے اور محبت و خلوص کا یہی جذبہ اس کی شاعری میں بھی منعکس ہوتا دکھائی پڑتا ہے۔انسانوں سے محبت، فرد کا رشتہ سماج سے جوڑتی ہے اور سماج سے جڑت سماجی، سیاسی، ثقافتی اور تہذیبی شعور کو جلا بخشتی ہے جس کا اظہار ہمیں ارشد کی شاعری میں واضح نظر آتا ہے۔اس کا ثبوت اس کے پہلے شعری مجموعے "عجب سی بے قراری" سے کر حال ہی میں اشاعت پذیر ہونے والے "بساطِ زیست" میں جابجا اور برملا دکھائی پڑتا ہے۔

پھر اس کے بعد ہی دیتا ہے کام کی اجرت
ہمارے خون سے پہلے وہ زر نکالتا ہے

وہ جو فٹ پاتھ پہ اوندھا پڑا ہے
کبھی اس شخص کا بھی گھر رہا تھا

زندگی آپ سکھاتی ہے قرینے سارے
زخم ملتے ہیں تو جینے کا ہنر آتا ہے

سماجی اور سیاسی شعور کو اپنی شعری کائنات کا حصہ بناتے ہوئے وہ فن کے خصائص کو نظر انداز نہیں کرتا اور نہ قاری کو احساس ہونے دیتا ہے کہ وہ یہ کام شعوری طور پر کر رہا ہے۔وہ کمال ہنر مندی اور چابکدستی سے غزل کو اس کی جملہ رعنائیوں سمیت اپنے مخصوص اسلوب سے ممزوج کر لیتا ہے، جس نے اس کی شاعری کو خاص آہنگ اور توازن عطا کیا ہے۔اس کی غزل میں غنائیت صرف لفظوں سے صورت پذیر نہیں ہوئی بلکہ اس کے عقب میں ارفع خیال، خالص جذبوں کا آہنگ اور داخلی کیفیات کی دھڑکن کو بھی پردۂ سماعت پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔وہ فن کے پردے میں جن موضوعات کو قاری تک پہنچانا چاہتا ہے وہ ان پر حاوی نہیں ہوتا بلکہ ان کو خود پر طاری کرتا ہے اور پھر اپنے داخلی

آہنگ سے تخلیق کے سرد ود پر اک نئی دھن میں ڈھال لیتا ہے۔اکثر شعرا کے ہاں خیال اور ڈکشن میں عدم توازن کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو شاعری کی شعریت کو نہ صرف مجروح کرتی ہے بلکہ قاری کے بہجت اور سرور کشید کرنے کے عمل کو بھی متاثر کرتی ہے مگر ارشد محمود ارشد کے ہاں ایسا نہیں ہے:

تمھاری تشنگی دیکھی نہیں گئی مجھ سے
میں اپنی اوک میں دریا اٹھا کے لایا ہوں
قید سانس نچوڑ لیتی ہے
جال کہنے لگا پرندوں سے
کوئی مسجد ہو ، کلیسا ہو یا کوئی بُت کدہ
ہر جگہ موجود ہے یا پھر خدا ہوتا نہیں

ارشد نے یہ ہنر مقدم اور معاصر شعرا کے مطالعے، عمیق مشاہدے اور گہرے تفکر سے کشید کیا ہے۔اسی لیے اس کی شاعری احساس زیست کا احساس دلاتی،فطرت کے متنوع رنگوں کو تخلیقیت کے سانچوں میں مقید کر لیتی ہے۔وہ احساس اور جذبے کو فطرت کے استعاروں میں خوش اسلوبی سے بیان کرتا ہے۔درخت، سایہ، سورج، دھوپ، ہوا، مٹی، پرندے، بادل، بارش، صحرا اور پھول جیسے الفاظ اس بات کی دلیل ہیں کہ وہ فطرت سے محبت کرنے والا اور زمین سے جڑا ہوا فن کار ہے۔وہ مظاہرِ فطرت کو استعاروں اور علامتوں کے روپ میں استعمال کرنے کا ہنر بخوبی جانتا ہے۔اس کی شاعری میں کبھی سورج،رات کے اندھیروں کے مدمقابل روشنی بکھیرنے کا استعارہ بنتا ہے تو کبھی چراغ، تیز ہواوں کے سامنے مزاحمت کا نمایندہ۔ارشد نے اپنی شاعری میں جو استعاراتی نظام تشکیل دیا ہے وہ اس کے زرخیز تخیل اور تخلیقی وفور کا آئینہ دار ہے۔اس کے تخلیق کردہ استعارے کبھی سیاسی و سماجی بے اعتدالیوں کو بیان کرتے ہیں تو کبھی ہجر کی تڑپ اور وصل کو اپنے دامن میں چھپائے ہوتے ہیں:

پھولوں کو رعنائی دیں
تتلی ، بلبل ، خار ، ہوا
پرندے گھونسلوں میں جا چکے تھے
اکیلی کونج ہی کرلا رہی تھی
پیار اتنا کیا ہے مٹی سے
خاک میں ہو گیا ہوں میں

ارشد کی شاعری میں معاصر شعرا کے برعکس عورت کا ایک منفرد تصور ابھرتا ہے۔اس کے ہاں عورت جنسی لذت کا آلہ نہیں بلکہ تخلیق کا منبع ہے۔وہ نفسانی خواہشات کی تسکین کا ذریعہ نہیں بلکہ روحانی ترفع کا وسیلہ ہے۔اس کا خیال ہے کہ عشق حقیقی کے سب راستے عشق مجازی کی راہوں سے ہو کر گزرتے ہیں۔وہ کائنات میں رنگینی اور رعنائی کو وجودِ زن کا شاخسانہ خیال کرتا ہے اور مرد کے وجود کے لیے عورت کو لازم سمجھتا ہے۔عورت مختلف روپ میں مرد کو توانائی اور حرارت فراہم کرتی جو باطنی اور خارجی سفر میں اس کی معاون ہوتی ہے۔

بنایا ہے مصور نے حسین شاہکار عورت کو
الگ پہچان دیتا ہے کہانی کار عورت کو

پھر اک دن ان کی قسمت میں لکھی جاتی ہے رسوائی
زمانے میں سمجھتے ہیں جو کاروبار عورت کو

کالی زلف کا لوہا منوا سکتی ہو
میری سوچ کے سورج پر چھا سکتی ہو
سنو! غیر ممکن ہمارا ملن ہے
میں اک خاک زادہ، تو بنتِ گگن ہے

ارشد کی شاعری جدید شعری حسیات سے ہم آہنگ اور تازگی کا عنصر لیے ہوئے، بامعنی استعاروں اور علامتوں سے مزین جمالیاتی خصائص کی حامل شاعری ہے جس میں خیال کی ارفعیت، جذبے کی شدت، تخیل کی فراوانی اور ادبی پیرایوں کا استعمال خوب صورتی سے کیا گیا ہے۔وہ محنت اور ریاضت کا قائل ہے جو اس کے روشن مستقبل اور خوابوں کی تکمیل کی ضمانت ہے۔ارشد محمود ارشد نے تخلیق کے کٹھن سفر کا، "بساطِ زیست" کی صورت میں چوتھا سنگ میل عبور کیا ہے لیکن ابھی تو آغاز ہے،آگے طویل سفر اس کا منتظر ہے۔حوصلہ، صبر اور ہمت اگر اس کے شامل حال رہے تو راستا آسان رہے گا۔"بساطِ زیست" کی اشاعت پہ ارشد کو مبارک باد اور اس کے لیے ڈھیروں دعائیں۔

نقد و نظر

تبسم نواز وڑائچ۔۔کراچی

"بساطِ زیست" شعری مجموعہ ہے ارشد محمود ارشد کا۔ارشد محمود ارشد سرگودھا کے اُن نوجوان شعرا میں سے ہیں جو جہدِ مسلسل پہ یقین رکھتے ہیں اور کسی ستائش کی تمنا یاصلہ کی پرواہ کئے بغیر اپنی لگن اور ریاضت سے فن اور سخن کی کٹھن اور جانگسل گھاٹیوں کو عبور کرتے چلے جارہے ہیں ھمارے اس باھمت سخنور نے ایک طویل سفر طے کر کے اب وہ مقام پالیاھے کہ جہاں خونِ جگر گلکاریاں کرتاھے اور لفظ خود اپنے ھونے کی گواہی دیتے ہیں حرف مصرعوں میں ڈھلتے ہیں مصرعے پھول بنتے ہیں اور پھر پھولوں سے خوشبوآتی ہے ہمارے اس زندہ دل تخلیق کار کے فکروفن کی خوشبواب چمنستانِ ادب میں اپنے جگمگاتے حروف اور مہکتے لفظوں سے ایوانِ غزل کے سنجیدہ قاری سے بیساختہ داد وصول کر رہی ہے اور ارشد محمود ارشد شعری حلقوں میں ایک ایسے شاعر کے طور پہ متعارف ہو رہاہے کہ جو ادب برائے فن کی بجائے ادب برائے زندگی جیسے انقلابی نظریئے اور حیات پرور روئیے کی آبیاری کر رہاہے جو تاریکیوں کی مایوس کن شب میں صبحِ نو کی امید کی نوید دیتا ہے جو جگنوؤں رنگوں پھولوں بلبلوں کوئلوں پرندوں پودوں نغموں سازوں دھنوں کہکشاؤں سے زندگی کی بشارتوں کا حسن کشید کر کے زندہ ذہنوں کی سماعتوں کو دان کرتاہے جو شہد کی مکھی کی طرح سوجھل جذبوں کا رس اکٹھا کر کے اپنے شعروں کی صورت قطرہ قطرہ منجمد ہوتے سماجی و معاشرتی احساس کی حنوط شدہ میت کے حلق میں ٹپکاتا اور اسے نئی زندگی سے ہمکنار کر کے ایک طبیب اور مسیحا کا کردار بھی نبھاتا ہے۔یہی ایک سچے فنکار کی علامت ہے۔

میں یہاں پہ یہ بھی واضح کردوں کہ ارشد محمود ارشد کے ابتک کے کامیاب تخلیقی سفر کا میں عینی شاھد ھوں اور ذاتی طور پر جانتاھوں کہ ابتک اس نے جو کامیابیاں سمیٹی ھیں وہ کسی کی مرھونِ منت نہیں بلکہ خالصتاً اپنی محنت لگن انتھک ریاضت اور مجاھدے کی بدولت دولتِ فکروفن کو اپنے سماج میں بانٹنے کا اھل قرار پایاھے اس نے اپنی ادبی شناخت اور فکری قامت کے تعارف کے لئے کسی بڑے نام کی بیسا کھیوں یا میڈیا کی چکاچوند کا سہارا نہیں لیابلکہ اپنے سچے لفظوں اور مہکتے ھوئے جذبوں کی صداقت پہ بھروسہ کیاھے اور پروردگارِ لوح وقلم نے اسے باتوقیر اور معتبر کیاھے میں شکرگزار ھوں کہ ارشد محمود ارشد نے مجھے اپنی اس تخلیقی کامیابی کا جشن مناتے ھوئے یاد رکھااور یہ گرانقدر شعری دستاویز کہ جو بساطِ زیست کے نام سے منصہء شہود پہ آئی ھے خصوصی طور پر عنایت کی ھے دعاگو ھوں کہ میرا یہ بہت ھی پیارادوست یونہی خوبصورت موسموں کی سوغاتیں اپنے خوبصورت لفظوں کے

نگینوں کی صورت بانٹتا رہے اور کامیابیاں سمیٹتا رہے اور میرے جیسے ادب کے فقیروں کو سرشار کرتا رہے۔۔۔آمین

بساطِ زیست سے چند اشعار آپکے ساتھ شئیر کر رہا ہوں

اس لئے سر پہ یہ اٹھایا ہے غم کا سورج
دھوپ پڑتی ہے تو پیڑوں پہ ثمر آتا ہے

کوئی تو سانحہ گزرا ہے اس پرندے پر
کہ آدھی رات کو جو گھونسلے سے باھر ہے

میں بھی سخن شناس ہوں کچھ حق مجھے بھی دے
شہرِ ادب کو باپ کی جاگیر مت سمجھ

دن بدلتے نہیں ہیں رونے سے
حوصلہ ، دیکھ حوصلہ مرے دوست

بینائی کا فیصلہ ہونے والا ہے
میں نے اک سورج سے آنکھ ملا لی ہے

جس کے دل میں حبِ اھلبیت ہو
موت ملتی ہے اسے اعزاز کی

پتھروں سے کلام کرنا ہے
کیسے کھولوں زباں اذیت ہے

روشنی مجھ سے ہمکلام ہوئی
عکس ابھرا ترا چراغوں سے

بہت ارزاں ہوئی ہے آدمیت
کہ اب معیار مرتے جا رہے ہیں

کوئی مسجد ہو کلیسا ہو یا کوئی بتکدہ
ہر جگہ موجود ہے یا پھر خدا ہوتا نہیں

اس لیے شعر کہنے لگتا ہوں
بڑھ نہ جائے غبار سینے میں!

یہ ہے عصر جدید کی وہ توانا آواز جو سننے، پڑھنے والے کو ایک بار ضرور اپنی جانب متوجہ کر لیتی ہے، ہم بات کر رہے ہیں آج کے شاعر ارشد محمود ارشد صاحب کی جنکا مجموعہء کلام "بساطِ زیست" ہمیں موصول ہوا ہے، ارشد صاحب کی شاعری زیست کے رنگوں کی وہ گلکاری ہے جس میں زندگی اپنے تمام رنگوں کی چھب دکھلاتی نظر آتی ہے، زندگی جو کبھی دم ہے، کبھی رم ہے کبھی سوز ہے کبھی ساز ہے وہ اپنی تمام تر توانائیوں سے ابن آدم کو کہاں کہاں، کس کس طرح لیے پھرتی ہے کہاں سجدہ کراتی ہے کہاں ٹھوکر لگا کر سبق دے کر استاد کا فریضہ بھی سنبھال لیتی ہے، اس تمام زیستن کا مشاہدہ و تجربہ زندگی کے تمام روّیوں کو سمیٹ کر ارشد صاحب نے انہیں الفاظ کا لباسِ پیرہن کمال خوبی سے عطا کیا ہے اور بقول شاعر،

میں نے یہ جانا کہ گویا
یہ بھی میرے دل میں ہے

کے مصداق قاری انکے کلام سے متاثر ہوئے بغیر رہ نہیں سکتا،

انکی شاعری داخلیت و خارجیت کا خوبصورت اظہار ہے، کلام آورد کی خامی سے پاک، آمد کا مظہر ہے اور یہی انکے کلام کی سب سے بڑی خوبی ہے، بساطِ زیست میں باندھے مضامین سے یہ اندازہ بخوبی ہوتا ہے کہ شاعر فطرت و قدرت کا دلدادہ ہے اسے فطرت سے محبت ہے جسکا اظہار انہوں نے بارہا اپنے کلام میں کیا ہے، ارشد صاحب نے جسطرح زندگی کو برتا ہے اور اسکے حقائق کو تسلیم کیا اسکا اظہار انکے کلام سے ہوتا ہے جس میں خوشیوں کا تناسب غموں کی نسبت کم ہے، اور جہاں یہ کیفیت حضرتِ انسان پر گذرتی ہے صرف وہی شخص زندگی کو درست طور پر سمجھنے کی صلاحیت و ادراک رکھتا ہے، کیونکہ رنج والم سونے کی وہ کٹھالی ہے جو انسان کو خالص بناتی ہے، یہی وجہ ہے کہ بساطِ زیست میں ہمیں زندگی سانس لیتی محسوس ہوتی ہے، زندگی کے معمولات اور روّیے الفاظ و مضامین کے نئے پیرہن میں جگمگاتے انکی غزلیات میں اپنی جگہ بناتے دکھائی دیتے ہیں، پامال مضامین کو تازگی اور نئی توانائی عطا کرنا ارشد صاحب کا خاصہ ہے اس پر طرہ یہ کہ انکے کلام میں جدید شعری حسیات اپنی تمام تر جولانیوں کے ساتھ خود نمائی کا گھونگھٹ کاڑھے بیٹھی ہیں، ارشد صاحب کا تخلیقی رجحان معاملاتِ دل سے ہوتا ہوا ہمارے معاشرتی و سماجی روّیوں سے شیر و شکر ہو کر ایک نیا جہانِ معنی پیدا کرتا ہے جس کی تشریح کے رنگ ہر انسانی خاکے میں مدغم ہوتے محسوس کیے جا سکتے ہیں، انکا کلام غمِ ذات اور غمِ دوراں کا ایک متناسب مجموعہ ہے کیونکہ یہی تناسب حاصل زیست ہے، عمدہ شعر کہنے کے لیے جس ایقان، آمد، وجدان کی ضرورت ہوتی ہے اللہ تعالیٰ نے ارشد محمود ارشد کو ان سے خوب بخشا ہے جس کا خوبصورت ثبوت بساطِ زیست خود ہے، دعا ہے کہ ارشد صاحب کا یہ تخلیقی سفر یونہی جاری و ساری رہے تاکہ قارئین انکے تفکر آفرین کلام سے ہمیشہ مستفید ہوتے رہیں !!!

بساطِ زیست پر تبصرہ

ناہید مرزا۔ کراچی

اس لیے شعر کہنے لگتا ہوں
بڑھ نہ جائے غبار سینے میں!

یہ ہے عصرِ جدید کی وہ توانا آواز جو سننے، پڑھنے والے کو ایک بار ضرور اپنی جانب متوجہ کر لیتی ہے،
ہم بات کر رہے ہیں آج کے شاعر ارشد محمود ارشد صاحب کی جنکا مجموعہء کلام "بساطِ زیست" ہمیں موصول ہوا ہے۔ارشد صاحب کی شاعری زیست کے رنگوں کی وہ گلکاری ہے جس میں زندگی اپنے تمام رنگوں کی چھب دکھلاتی نظر آتی ہے،زندگی جو کبھی دم ہے، کبھی رم ہے کبھی سوز ہے کبھی ساز ہے وہ اپنی تمام تر توانائیوں سے ابنِ آدم کو کہاں کہاں، کس کس طرح لیے پھرتی ہے کہاں سجدہ کراتی ہے کہاں ٹھوکر لگا کر سبق دے کر استاد کا فریضہ بھی سنبھال لیتی ہے،اس تمام زیستن کا مشاہدہ و تجربہ زندگی کے تمام رؤیوں کو سمیٹ کر ارشد صاحب نے انہیں الفاظ کا لباسِ پیرہن کمال خوبی سے عطا کیا ہے اور بقول شاعر،

میں نے یہ جانا کہ گویا
یہ بھی میرے دل میں ہے

کے مصداق قاری انکے کلام سے متاثر ہوئے بغیر رہ نہیں سکتا، انکی شاعری داخلیت و خارجیت کا خوبصورت اظہار ہے،کلام آورد کی خامی سے پاک،آمد کا مظہر ہے اور یہی انکے کلام کی سب سے بڑی خوبی ہے۔بساطِ زیست میں باندھے مضامین سے یہ اندازہ بخوبی ہوتا ہے کہ شاعر فطرت و قدرت کا دلدادہ ہے اسے فطرت سے محبت ہے جسکا اظہار انہوں نے بارہا اپنے کلام میں کیا ہے، ارشد صاحب نے جسطرح زندگی کو برتا ہے اور اسکے حقائق کو تسلیم کیا اسکا اظہار انکے کلام سے ہوتا ہے جس میں خوشیوں کا تناسب غموں کی نسبت کم ہے،اور جہاں یہ کیفیت حضرتِ انسان پر گزرتی ہے صرف وہی شخص زندگی کو درست طور پر سمجھنے کی صلاحیت و ادراک رکھتا ہے،کیونکہ رنج والم سونے کی وہ کٹھالی ہے جو انسان کو خالص بناتی ہے،یہی وجہ ہے کہ بساطِ زیست میں ہمیں زندگی سانس لیتی محسوس ہوتی ہے،زندگی کے معمولات اور روئیے الفاظ و مضامین کے نئے پیرہن میں جگمگاتے انکی غزلیات میں اپنی جگہ بناتے دکھائی دیتے ہیں، پامال مضامین کو تازگی اور نئی توانائی عطا کرنا ارشد صاحب کا خاصہ ہے اس پر طرہ یہ کہ انکے کلام میں جدید شعری حسیات اپنی تمام تر جولانیوں کے ساتھ خود نمائی کا گھونگھٹ کاڑھے بیٹھی ہیں،ارشد صاحب کا تخلیقی رجحان معاملاتِ دل سے ہوتا ہوا ہمارے معاشرتی و سماجی رؤیوں سے شیر و شکر ہو کر ایک نیا جہانِ معنی پیدا کرتا ہے جس کی تشریح کے رنگ ہر انسانی خاکے میں مدغم ہوتے محسوس کیے جا سکتے ہیں،انکا کلام غمِ ذات اور غمِ دوراں کا ایک متناسب مجموعہ ہے کیونکہ یہی تناسب حاصلِ زیست ہے، عمدہ شعر کہنے کے لیے جس ایقان،آمد،وجدان کی ضرورت ہوتی ہے اللہ تعالیٰ نے ارشد محمود ارشد کو ان سے خوب بخشا ہے جس کا خوبصورت ثبوت بساطِ زیست خود ہے،
دعا ہے کہ ارشد صاحب کا یہ تخلیقی سفر یونہی جاری و ساری رہے تاکہ قارئین انکے تفکر آفرین کلام سے ہمیشہ مستفید ہوتے رہیں !!!

ارشد کی " کبھی میں یاد آؤں تو"

فوزیہ احسان رانا

ارشد محمود ارشد کی کوئی غزل یا نظم نظر سے گزرتی تھی تو یہی گمان ہوتا تھا کہ شاید پختہ عمر کا آدمی ہے جو زیست کے سارے رنگ دیکھ اور برت چکا ہے۔ اس کی کتاب " کبھی میں یاد آؤں تو۔۔۔" پڑھنے کا اتفاق ہوا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ وہ تو ابھی کم عمر ہے لیکن اس کی شاعری، اس کا اسلوب اور اندازِ بیاں حیران کن ہے۔ اس کی شاعری میں برسوں کا تجربہ بولتا ہے۔ چھوٹی عمر میں ہی وہ شعر گوئی کی طرف راغب ہوا اور اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا لیا۔ سادہ فہم اندازِ بیاں، مکاری اور عیاری سے دور ارشد محمود ارشد صرف محبت کی بات نہیں کرتا بلکہ اپنی روایات کی پاسداری نبھاتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اور اس کا دکھ اس کی محرومیاں اجتماعی ہیں۔

امیرِ شہر تو یہ جانتا ہے
کئی بھوکے بچارے جاگتے ہیں

ارشد محمود اپنے گرد و نواح سے باخبر ہے۔ آج کا شاعر، جدت پسندی کا شاعر گو کہ آج کے اس تیز رفتار دور میں کوئی بھی چیز انوکھی اور نئی نہیں رہی۔ تجسس کا مادہ لوگوں میں سے کم ہوتا جا رہا ہے۔ پھر بھی ارشد محمود ارشد کی شاعری نئی جدتوں سے روشناس کرواتی ہے۔ یہ شاعری قاری کو نہ صرف چونکنے پہ اکساتی ہے بلکہ ایک ایسا حصار پڑھنے والے کے گرد قائم کر دیتی ہے کہ قاری ساری کتاب ایک ہی نشست میں پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ارشد کی شاعری، پڑھنے والے کو آنکھ بند کر کے خوابوں کے حوالے کر دیتی ہے اور ذہن کو آسودگی اور دل کو طمانیت سے لبریز کر دیتی ہے۔ ان کے تخیل کا کینوس بہت وسیع ہے۔ وہ بڑی سے بڑی بات عام فہم اور سادہ زبان میں پیش کرتے ہیں۔ آج ذرائع ابلاغ نے دنیا کا کوئی کریہہ منظر، کوئی تاریک پہلو آنکھوں کی رسائی سے دور نہیں رہنے دیا۔ بہت واضح اور صاف نظر آتا ہے کہ اس زمین کے خداؤں نے دنیا کو جہنم بنا دیا ہے۔ جو ارشد جیسے حساس اور رحم دل شاعر کی نظر سے پوشیدہ نہیں بلکہ وہ اس درد کو شدت سے محسوس کرتا ہے۔

بے کلی بڑھنے لگی ہے جو امیرِ شہر کی
کیا کسی بے کس کی اس کو بددعا لگنے لگی

تخلیقی وفور سے سرشار ذہن و فکر کے لیے یہ کیفیات گداز پیدا کرتی ہیں کہ شعر کہے بغیر بات نہیں بنتی۔ وہ فطری انداز سے اپنے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ وہ کہیں پیار کی بھیگی بھیگی رت میں چاہت کے جذبے سے سرشار نظر آتے ہیں تو کہیں سراپا جستجو اور التجا بھی نظر آتے ہیں۔ خواہشوں

کی تکمیل کے لیے گو کہ انا کو بہت اہمیت دیتے ہیں مگر محبت میں جارحیت کہیں نظر نہیں آتی۔ چھین لینا یا مانگ لینا ان کے ہاں نظر نہیں آتا وہ اپنی ایک آرزو یوں بیان کرتے ہیں۔

وہ کیا بھلا مٹائے گا تشنہ لبی مری
چاہت کی ایک بوند جو دیتا نہیں کبھی

موسم، پرندے اور شجر ارشد محمود ارشد کے خاص موضوع ہیں۔ وہ بہار موسموں کی آس میں دلکش منظروں کو دیکھ رہا ہے۔ وہ اپنی ہر غزل اپنی ہر نظم میں محبت کا نغمہ گر ہے۔ وہ محبت کا شاعر اور محبت ہی کا خوگر ہے۔ اور یہی کیفیات ہر رنگ و روپ میں اس کے خیالات اور بلند آدرش کو اجال رہی ہے۔ وہ نظموں میں بھی نرم اور دھیمے لہجے کا حامل نظر آرہا ہے۔ اس کے اظہار میں ممنونیت، سادگی، ملائمیت اور حلاوت ہے جو چھوٹے چھوٹے مصرعوں میں خیال کے منظروں کو دور تک لے کر جاتی ہوئی محسوس ہو رہی ہیں ۔ ان کی نظموں کی ترسیل میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ اس کی بہت کچھ سوچتی آنکھیں کبھی ماضی کے خوبصورت منظروں میں کھو سی جاتی ہیں جہاں وہ اپنی روح کی اساس اور اپنے ہونے نہ ہونے کا جواز ڈھونڈ رہا ہے۔ وہ شاعری کو ایسے مقام پر لے کر آیا ہے جہاں ایک ردھم اور دل پذیر کسک نظر آتی ہے۔

خبر نہیں ہے کہ میں کس گھڑی چلا جاؤں
صدائیں آنے لگیں اب تو آسماں سے مجھے

اس کے ہاں قناعت پسندی بھی نظر آتی ہے "جو ہے جیسا ہے کی بنیاد پر خوش رہنے والا شاعر۔۔۔

رزق کی خاطر کیوں خود کو ہلکان کریں
لکھنے والا لکھ دے جتنا ، دیتا ہے

یہ بات قاری کے ذہن کی گہرائیوں میں گردش کرتی ہے تو وہ شاعر کا دل سے معترف نظر آتا ہے۔ انا پرستی اس کا شیوہ ہے لیکن وہ انا کو اپنا اوڑھنا بچھونا بناتا نظر نہیں آتا کہ حد سے بڑھی ہوئی انا بھی آدمی کو زودرنج بنا دیتی ہے۔

کسی محتاج کو جیسے ضرورت مار دیتی ہے
انا کے ٹوٹ جانے سے ندامت مار دیتی ہے

ارشد محمود ارشد کے ہاں کہیں کہیں نارسائی کا کرب جھلکتا ہوا سا بھی دل گرفتگی میں مبتلا کرتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے تخلیق کار نے ملنے، بچھڑنے اور کھو جانے کے تمام تجربوں کو اپنی ذات پر برت لیا ہے وہ اپنے دکھ اور محرومیاں، یادوں کی پرچھائیں اور اپنے دل کے سارے درد ہمارے ساتھ بانٹ رہا ہے اور اپنے تجربات قاری کے ساتھ ڈسکس کر رہا ہے

آتی ہے تیری یاد تو روتا ہوں آج بھی
میں تیرے انتظار میں بیٹھا ہوں آج بھی
مدت ہوئی ہے تارکِ دنیا ہوئے مجھے
کیوں میں تمہاری آنکھ میں چبھتا ہوں آج بھی

یہ محض اس کا فکری احساس ہی تو ہے کہ وہ اپنی عمر سے زیادہ قوتِ مشاہدہ اور سرعت رکھتا ہے۔ وہ دل کی بات سلیقے سے کہنا جانتا ہے۔ بے باکی اور لغو چیزیں ارشد کی شاعری میں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتیں۔ ارشد صرف تہذیب کا لبادہ نہیں اوڑھتا بلکہ وہ تہذیب یافتہ نوجوان شاعر ہے۔ اگرچہ اس کی معصومیت کی گہری چھاپ ابھی اس کی چہرے پر سجی ہے مگر زندگی کی سچائیاں بیان کرتے ہوئے اس کا لہجہ پختہ ہو چلا ہے۔ گہری سوچ اس کی، جنم سے پہلے کا قصہ معلوم ہوتی ہے۔ سنجیدگی و بردباری اس کے رویے سے جھلکتی ہے جو اس کی شاعری میں در آتی ہے۔

جہاں پر کوڑیوں کے مول میں انصاف بکتا ہے
وہاں مظلوم کو اکثر عدالت مار دیتی ہے

اس کی شاعری میں غمِ جاناں اور غمِ دوراں کا حسین اور دلکش امتزاج بھی ہے جو قاری کے دل کو مسحور کن ساعتیں فراوانی سے عطا کرتا ہے ارشد کی نظمیں محبت اور سوداگر 'بلاشبہ کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر کر اثر پذیر ہوتی ہیں اور قاری تخلیق سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ پاتا۔ شاعری کا اثر دیرپا ہے وہ جادوگر ہے، ساحر ہے اپنی شاعری کے طلسم میں جکڑ لینے کا ہنر جانتا ہے۔ وہ زندگی کے بدصورت رویوں میں بھی خیر اور محبت کا پہلو تراشتا ہے۔ بلاشبہ یہ ارشد محمود ارشد کا ہی خاصہ ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

محبت تشنہ لب رہ کر کبھی اک بوند کو ترسے
محبت دل کے صحرا پہ گھٹا بن کر کبھی برسے

محبت رسمِ دنیا کے کبھی تابع نہیں آتی
محبت دل میں بس جائے ، کسی صورت نہیں جاتی

محبت چڑھ کے سولی پہ بھی اپنا آپ منوائے
محبت جس کی دل میں ہو زباں بھی اس کی ہو جائے

"بساطِ زیست" معاصر شعری ادب میں اہم اضافہ

ڈاکٹر کاشف رفیق

پہلے وقتوں میں لوگ اپنے احساسات و جذبات کے اظہار کے لیے شاعری کو ذریعہ بنایا کرتے تھے۔ مگر ادب کے اِس عہدِ غربت میں کہ جب دُنیا کی ہر چیز کمرشلزم کا شکار ہوئی ہے شاعری بھی اِس کے اثر سے محفوظ نہیں رہ سکی۔ اب تو زیادہ تر شعراء مشاعرے پڑھنے کی دوڑ میں لگے ہوئے ہیں۔ بلکہ اکثر شعراء تو لکھتے ہی مشاعروں کے لیے ہیں۔ اور کچھ شعراء فیس بک پر ملنے والی جھوٹی واہ واہ کو کامیابی کا معیار سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگ اب خال خال نظر آتے ہیں جو فنِ شاعری کے ساتھ انصاف کرتے ہیں، جن کی شاعری دل سے نکلی ہوئی محسوس ہوتی ہے، اور جو خلوص کے ساتھ ادب کی خدمت کو اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ایسے ہی معدودے چند شعراء میں سے ایک ارشد محمود ارشد ہیں جو پوری توانائی کے ساتھ ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ شہرِ سخن میں ارشد محمود ارشد کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ کہنہ مشق شاعر ہیں اور اب تک اُن کے چار شعری مجموعے شائع ہو کر قبولیتِ عام کی سند حاصل کر چکے ہیں۔ علاوہ ازیں وہ کئی شعری انتخاب مرتب کر چکے ہیں۔ فیس بک پر اُنھوں نے "پزیرائی" کے نام سے ایک سلسلہ شروع کر رکھا ہے جس کا چرچا پاکستان اور بھارت سمیت اُن تمام ممالک میں ہے جہاں اُردو شاعری پڑھی جاتی ہے۔ "پزیرائی" کے ذریعے ارشد محمود ارشد نے جہاں کئی معروف شعراء کا منتخب کلام شاعری کا ذوق رکھنے والوں تک پہنچایا وہیں کئی ایسے اچھے اور تازہ کار شعراء کو بھی متعارف کروایا جنھیں اس سے قبل ادبی دُنیا میں پہچان نہیں مل سکی تھی۔ غرض کہ ارشد محمود ارشد صاحب ادب کی حقیقی خدمت کر رہے ہیں۔ میری اُن سے پہلی بار ملاقات ۲۰۱۷ء میں ہوئی مگر میں گزشتہ دس برس سے اُن کے نام اور کام سے واقف ہوں۔ مجھے یاد ہے دس سال قبل اُنھوں نے آن لائن موبائل فون مشاعروں کا تصور عام کیا تھا۔ جس سے مختلف شہروں میں مقیم شعراء کے درمیان رابطوں اور جان پہچان کا سلسلہ شروع ہوا۔ گویا وہ شروع ہی سے ادب کی خدمت کے جذبے سے سرشار ہیں۔ اِس میں اہم پہلو یہ ہے کہ وہ خود کو نمایاں کرنے کی کوشش نہیں کرتے اور اِس قسم کی مثال آج کے دور میں شاذ ہی ملتی ہے۔

ارشد محمود ارشد کا چوتھا شعری مجموعہ "بساطِ زیست" گزشتہ برس کے آخر میں شائع ہوا۔ چند روز پہلے جب میں سعودی عرب میں دو برس قیام کے بعد وطن واپس آیا تو اُنھوں نے بذریعہ ڈاک مجھے یہ مجموعہ ارسال کیا۔ اِس محبت کے لیے میں اُن کا بے حد ممنون ہوں۔ "بساطِ زیست" کا مطالعہ میرے لیے خوشگوار احساس اور طمانیت کا باعث بنا۔ ارشد محمود ارشد بلاشبہ پختہ شاعر ہیں۔ اُن کے شعری کینوس پر فطرت کے رنگ جا بجا بکھرے ہوئے ہیں۔ یہ کسی فنکار کے حساس ہونے کی علامت ہے۔ "بساطِ زیست" میں ارشد محمود ارشد کی منظر نگاری کمال کی ہے۔ اِس کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے

یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے آپ ٹی وی سکرین پر یکے بعد دیگرے نئے مناظر دیکھ رہے ہوں اور ہر منظر ایک مکمل کہانی پیش کر رہا ہو۔ کتاب کا عنوان "بساطِ زیست" اِس میں شامل شاعری سے کُلی طور پر مطابقت رکھتا ہے کہ ارشد محمود ارشد نے زندگی کی چھوٹی بڑی حقیقتوں کا بہت باریک بینی سے مشاہدہ کیا ہے۔ اُنھوں نے اپنی زندگی کے گہرے تجربات کو شعری سانچے میں ڈھالتے ہوئے فنی مہارت اور شعری لطافت کا بھرپور خیال رکھا ہے۔ اُن کے مصرعوں کی چُست بندش، محاوروں کا بر محل استعمال اور الفاظ کی خوبصورت نشست و برخاست اُن کی فنی پختگی کی واضح دلیل ہے۔

ارشد محمود ارشد کی شاعری میں کہیں دیہی زندگی کی تصویر کشی ہے تو کہیں انسانوں کے انفرادی و اجتماعی مسائل کا تذکرہ، کہیں لوگوں کے منفی رویوں کی حوصلہ شکنی اور کہیں اپنی ذات سے مکالمہ۔ گویا وہ خارجی عوامل کو اپنے داخلی احساسات میں جذب کر کے نتائج اخذ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اپنی مٹی سے محبت کا اظہار ارشد صاحب کے یہاں بہت شدت سے ملتا ہے۔ کسی شاعر کے لیے محبت کے جذبہ واحساس سے پہلو تہی ممکن نہیں لیکن ارشد محمود ارشد نے عشقِ مجازی کو اپنی فکر پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ ارشد محمود ارشد نے عشقیہ معاملات کے بیان کے لیے جدید طرزِ اظہار اپنایا ہے۔ سطحیت اور عامیانہ پن سے گریز کیا ہے۔ غرض کہ ارشد صاحب کی شاعری کا نمایاں پہلو غور و تفکر ہے اور جدید معاصر غزل میں اس کی بہت اہمیت ہے۔ "بساطِ زیست" میں شامل غزلیں روانی، سلاست، ایمائیت، تہہ داری، حُسنِ تغزل اور شعری جمالیات جیسے اوصاف کی حامل ہیں۔ چھوٹی بحور میں بھی ارشد محمود ارشد نے عمدہ اشعار نکالے ہیں۔ برجستگی اِن اشعار کا خاصہ ہے۔ قارئینِ سخن اور بالخصوص نوجوان شعراء کو "بساطِ زیست" کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔ میری رائے میں "بساطِ زیست" معاصر شعری ادب میں اہم اضافہ ہے۔ اِس کامیاب شعری مجموعے کی اشاعت پر ارشد محمود ارشد صاحب دلی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کی توفیقات میں اضافہ فرمائے۔ آمین۔ آخر میں "بساطِ زیست" سے مشت از خروارے کے طور چند اشعار قارئین کے ذوق کی نذر

زمیں کی کوکھ سے پہلے شجر نکالتا ہے
وہ اِس کے بعد پرندوں کے پر نکالتا ہے

شبِ سیاہ میں جگنو بھی اک غنیمت ہے
ذرا سا حوصلہ اندر کا ڈر نکالتا ہے

پھر اِس کے بعد ہی دیتا ہے کام کی اُجرت
ہمارے خون سے پہلے وہ زر نکالتا ہے

گھنے درخت کے سائے میں جب قیام ہوا
مَیں پہلی بار پرندوں سے ہم کلام ہوا

بچا کے لایا تھا جنات سے مَیں شہزادی
اسی کے ساتھ کہانی کا اختتام ہوا

مَیں بھی سُخن شناس ہوں کچھ حق مجھے بھی دے
شہرِ ادب کو باپ کی جاگیر مت سمجھ

دیکھ لہجے کو ذرا دھیما ہی رکھنا ارشد
ورنہ وہ لڑکی بہت شور مچا سکتی ہے

جب ہم دونوں مٹی سے تخلیق ہوئے
پھر تجھ میں کیا ایسی بات نرالی ہے

اُسی کے ہاتھ پہ بیعت مَیں کر کے آیا ہوں
جو بوڑھا پیڑ کڑی دُھوپ میں کھڑا ہوا ہے

ایسے بھی آزار اُٹھانا ٹھیک نہیں
احسانوں کا بار اُٹھانا ٹھیک نہیں

بساطِ زیست کا شاعر

پروفیسر عمران راہب نوتکی

زندگی کی بساط کے مہرے اگر موافق ٹھہریں توہمات کی سیاہ رات ایک ہی چال میں جیت کے سورج کو افق کے زاویے پر طلوع ہوتے ہوئے دیکھ کر اجالے کی چادر اوڑھ کر سو جاتی ہے۔اگر حوصلہ جواں اور جذبوں میں حرارت ہو تو شبِ تار میں ایک جگنو من میں پنپنے والے ڈر کا گریباں چاک کر دیتا ہے۔ارشد محمود ارشد ایک ایسا نوجوان شاعر ہے جو عالمِ آب و خاک کے اندھیروں کو جگنو سے ادھیڑتا ہے۔شعر ملاحظہ ہو

شبِ سیاہ میں جگنو بھی اک غنیمت ہے
ذرا سا حوصلہ اندر کا ڈر نکالتا ہے

بساطِ زیست بھی کمال ہے کہیں دھوپ تو کہیں چھاؤں کا دلپذیر احساس ہے۔کسی جگہ کرب کا لامحدود سلسلہ ہے تو کبھی سرور کی خمار آلود کیفیت کی چاشنی ہے۔کہیں حقائق کی سرزمیں ہے تو کہیں تخیل کی بے باک پرواز سے گھنے شجر پہ پرندوں سے گفتگو کا سلسلہ ہے۔کبھی بساطِ زیست سے کردار نہیں نکلنا چاہتے تو کبھی کہانی کا اختتام حسین شہزادی کے کردار کی صورت زندہ رہتا ہے۔اشعار ملاحظہ ہوں۔

گھنے درخت کے سائے میں جب قیام ہوا
میں پہلی بار پرندوں سے ہم کلام ہوا
بچا کے لایا تھا جنات سے میں شہزادی
اسی کے ساتھ کہانی کا اختتام ہوا
کہانی لکھتا ہے ایسے کہ اس کا ہر کردار
نکلنا کوئی نہ چاہے مگر نکالتا ہے

ارشد محمود ارشد کی بساطِ زیست میں امکان موجود ہے۔ناممکنات کو ممکنات کے دائرے میں لانے کی روشن دلیل زندہ ہے۔

زرد آنکھوں میں کئی پھول کھلا سکتی ہے
وہ کسی روز مرے خواب میں آ سکتی ہے
غیر ممکن ہے مگر کر کے دکھا سکتی ہے
زندگی موت سے آنکھیں بھی ملا سکتی ہے

بساطِ زیست میں شام کا ڈھلنا، دھوپ کا چہرہ بدلنا، سوچ کا قدموں پہ چلنا، سمندر کے طلاطم میں کشتی کا بنا بادباں سنبھلنا، موت کا رستہ بدلنا، گرم سانسوں کے لمس سے طبیعت کا مچلنا، معصوم چڑیا کا عقاب سے الجھنا، گاؤں کی مٹی کا پاؤں پکڑنا اور نا جانے زندگی کے کتنے پہلو کروٹ بدلتے دکھائی دیتے ہیں۔

پاؤں پکڑے تھے بہت گاؤں کی مٹی نے مرے
کتنی مشکل سے ترے شہر کو ہجرت کی ہے

بساطِ زیست میں عام آدمی کی آواز کو بھی نقارہ خدا سمجھتے ہوئے جگہ دی گئی ہے۔ بساط زیست غمِ روزگار سے غمِ زندگی تک ایک سلسلہ وار کہانی ہے۔ بساطِ زیست معاشرے کے اس میلے کی جانب اشارہ ہے جس میں فرقت پازیب پہنے محور قص ہے۔ جہاں دلوں میں نفرت کا بسیرا ہے۔ جہاں چشمِ بینا اندھی ہے۔ جہاں زنجیرِ عدل گونگی ہے۔ جہاں مداری کی ڈگڈگی پہ لوک رقص جاری ہے۔ جہاں فٹ پاتھ کو ڈبل بیڈ کا درجہ حاصل ہے۔ جہاں بھوک کی ننگی دیوی بال کھولے ہے۔ جہاں آئینہ جھوٹ بولتا ہے۔ جہاں دستار پاؤں پر اور سر دار پہ سجتا ہے۔ جہاں جسم بکتے ہیں۔ جہاں طاقت کا دیو قامت بیل بدمست ہے۔

مداری بس تماشا کر رہا تھا
مگر بچہ جمورا مر رہا تھا
وہ جو فٹ پاتھ پر اوندھا پڑا تھا
کبھی اس شخص کا بھی گھر رہا تھا
عجب میلہ لگا ہے نفرتوں کا
جدھر دیکھو کدورت ناچتی ہے

ارشد محمود ارشد آج کے جدت پسند معاشرے میں سانس لیتے ہوئے اپنے شعار اور ان ہستیوں کو نہیں بھولا جن کا لہو دین کی شہ رگ میں رواں ہے۔ یہ نوجوان شاعر ان کی بارگاہ اقدس میں گلہائے عقیدت پیش کرتا ہوا نظر آتا ہے جن کو قرآن کے متبرک سینے میں کبھی طٰہٰ کہا جاتا ہے تو کبھی یسین کہا جاتا ہے اگر چہرے کی قسم کھائی جاتی ہے تو والفجر کہا جاتا ہے۔ نعت کے اشعار ملاحظہ ہوں

ان اندھیروں کو پھر روشنی چاہیے
اک نگاہِ کرم آپ کی چاہیے
جب تک آپ کا نام لب پہ رہے
تب تلک بس مجھے زندگی چاہیے

چند اشعار سلام کے ملاحظہ ہوں

شعور ضبط میں سب آگہی حسین کی ہے
چراغ دین میں یہ روشنی حسین کی ہے

انہی کے نام پہ اس کو لٹا بھی سکتا ہوں
کہ میرے پاس مری زندگی حسین کی ہے

خداوند سے دعا ہے کہ ارشد محمود ارشد کا زورِ قلم ہو اور زیادہ

بساطِ زیست کے چند شعروں پر سرسری تبصرہ

پروفیسر خالد شبیر احمد

ارشد محمود ارشد اردو ادب میں ایک منفرد نام ہے ادبی حوالے سے اگر دیکھا جائے تو اس نام کے ساتھ کئی شعری اور ادبی اوصاف وابستہ ہیں جن کا اعتراف بڑے بڑے شعراء اور ادبی ذوق رکھنے والے حضرات نے ان کی زیرِ نظر کتاب'' بساطِ زیست '' کے اولین اوراق میں کیا ہے۔ جس کا مختصر خلاصہ یہ ہے کہ انسانی شعور کو اُجاگر کرنے کے لیے ارشد محمود ارشد کی اس کتاب کو گراں قدر حیثیت حاصل ہے۔ ہر شاعر، شاعر نہیں ہوتا اور نہ ہر شعر، شعر ہوتا ہے۔ شعر کہنے کے لیے فنِ شاعری سے واقفیت کے ساتھ ساتھ وسیع مطالعہ اور تخیل کے کینوس کا بھی وسیع ہونا اشد ضروری اور لازمی ہے۔ تخیل کی بلندی کی مثال اُن کے اس شعر میں ملاحظہ فرمائیں

جگ کی وسعت کا بھرم بھی نہیں توڑا جاتا
ورنہ دنیا میری مٹھی میں سما سکتی ہے

اب دیکھئے ان کے ایک دوسرے شعر میں کیا خوب کہا گیا ہے

کوئی اے کاش مجھ کو ڈھونڈ لائے
میں خود کو بھول آیا ہوں کہیں پر

اس شعر کو بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے اس شعر کا خیال اتنا خوبصورت ہے کہ آدمی اسے پڑھ کر بے ساختہ شاعر کو داد دینے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے اس شعر کی تشریح اور موضوع کی وسعت اس قدر زیادہ ہے کہ چند جملوں میں اسے بیان کرنا شعر کی ناقدری کے مترادف ہوگا۔ شعر کے مفہوم میں بلا کی کشش ہے اور اسے کمال خوبی سے ذہن سے سطحِ قرطاس پر منتقل کیا گیا ہے شاعر فطرتاً شدتِ احساس کا پرتو ہوتا ہے اور یہی شدتِ احساس جب وہ شعروں میں منتقل کرتا ہے تو بات بن جاتی ہے اب دیکھئے ایک اور شعر میں کیا بات کہتے ہیں۔

اس لیے شعر کہنے لگتا ہوں
بڑھ نہ جائے غبار سینے میں

پھر اس کے بعد ایک اور شعر میں اتنی خوبصورت بات کرتے ہیں جو ایک سچی حقیقت ہے جسے تسلیم کرنے سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

اس لیے ایک ہی محبت کی
ایک ہی دل تھا یار سینے میں

اب ان کی ایک اور غزل سے ایک شعر میں شعر کی خوبی کا آپ خود اندازہ لگائیں کہ کیسا خوبصورت شعر

ہے یہ شعر پڑھتے ہی دل و دماغ ہی نہیں بلکہ روح تک مسرور ہوتی ہے مجھے تو ایک خوبصورت منظر اس شعر کے اندر چھپا محسوس ہوتا ہے جس منظر پر دل جھومنے لگتا ہے داد بے اختیار ہو کر زبان پر آجاتی ہے۔

دلِ مضطر کے سب کھلونے ہیں
تتلیاں ، پھول ، جل پری ، بارش

ان کے ایک اور شعر میں سچ اور جھوٹ، نیکی اور بدی کے درمیان آویزش اور اس کی بنیادی وجہ کو کس خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے یہ شعر ان کے شعری فن کا غماز ہے جس کا اعتراف نہ کرنا ادبی توہین کے مترادف ہے

چراغوں کو جلانے کی لگن میں
ہواؤں سے عداوت بڑھ گئی ہے

پھر ارشد محمود ارشد اپنی ایک دوسری غزل کے شعر میں معاشرے کی ایک برائی اور بدی، جس پر کسی کی بھی نگاہ نہیں ذکر کس خوبصورتی سے کرتے ہیں۔

سرِ محفل ہے کوئی محوِ رقصاں
پسِ پردہ ضرورت ناچتی ہے

ارشد محمود ارشد اپنی وضع کے منفرد شاعر ہیں جن کے تمام اشعار تخیل اور اسلوب کا ایک نادر نمونہ ہیں جو قارئین کے دل و دماغ پر ایسا تاثر قائم کرتے ہیں جو عارضی نہیں بلکہ مستقل ہوتا ہے اور یہی ایک بڑے شاعر کی خوبی ہے جو اسے ادب میں بہت دیر زندہ رکھتی ہے۔
اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

بساطِ زیست عکسِ زیست

گلِ نسرین۔۔ملتان

فطرت پرستی کی بنیاد فطری مظاہر کی تجسیم پر ہے زمین فطرت کی قدیم ترین چیز ہے۔سورج، چاند، ستارے ،سیارے،پہاڑ، دریا، سمندر، غرض بناتات سے چرند پرند اور انسان تک سبھی کا انحصار زمین پر ہے سبھی انجام کار خاک بن جاتے ہیں یا بن جائیں گے اور بالآخر زمین ہی میں خاک ہو جائیں گے۔یہ سبھی عناصر زندگی کرنے کے لیے کافی نہیں۔انسان کے اندر گوشت، خون، رگیں، پٹھے اور ہڈیاں جسم کی بناوٹ کرتے ہیں اور اسے ایک انسانی شکل عطا کرتے ہیں مگر جب تک انسان کے اندر احساسات و جذبات نہیں وہ ایک مکمل انسان نہیں کہلا سکتا اسی طرح مندرجہ بالا عناصر زندگی کے لیے کافی نہیں۔زندگی بذاتِ خود اپنے اندر جذبات و احساسات کا سمندر رکھتی ہے کیونکہ ان کے بغیر پوری کائنات اپنے تمام عناصر سمیت محض اجسام کا ڈھیر کہلائے گی روح کے بغیر اجسام کی کشش نہیں۔ بالکل اسی طرح اگر ارشد محمود ارشد کی شاعری سے فطرت پرستی اور انسان دوستی نکال دی جائے تو وہ ارشد محمود ارشد کی شاعری نہیں کہلائے گی۔کیونکہ یہی وہ بنیادی اوصاف ہیں جو اس کی شاعری پر غالب ہیں۔وہ شاعری کی زبان میں فطرت سے ہمکلام ہوتا ہے تو اس کی شاعری پر ورڈز ورتھ کی شاعری کا گمان ہوتا ہے وہ پرندوں، درختوں،پتوں، شاخوں، پھولوں، تتلیوں، جگنوؤں اور ہواؤں سے باتیں کرنے والا شاعر ہے جو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے بل بوتے پر عام طور پر اپنے ہم عصر شعراء میں نمایاں نظر آتا ہے۔ارشد کے کچھ اشعار دیکھئے

اس لیے سر پہ یہ اٹھایا ہے غم کا سورج
دھوپ پڑتی ہے تو پیڑوں پہ ثمر آتا ہے
زندگی آپ سکھاتی ہے قرینے سارے
زخم ملتے ہیں تو جینے کا ہنر آتا ہے
کٹ کے جب درخت گرتا ہے
پھڑپھڑاتے ہیں تب پرندے بھی

ارشد محمود ارشد کی شاعری میں محبت ایک آفاقی جذبہ ہے جو اس کے ہر لفظ اور حرف میں نمایاں محسوس ہوتا ہے محبت اس کے ہاں اس دنیا کا سب سے اعلیٰ اور سب سے سچا جذبہ ہے جس کے بغیر یہ جیون اور جیون کی ہر شئے ادھوری ہے مگر اس محبت کے ساتھ ساتھ اس کی شاعری پر گہری اداسی، یاسیت، غم واندوہ اور اندرونی کرب کا بہت گہرا احساس بھی طاری نظر آتا ہے۔

غم اٹھا کے بھی مسکراتا ہوں
کونسی خاک سے بنا ہوں میں
تو جہاں پھینک کر گیا تھا مجھے

دیکھ اب بھی وہیں پڑا ہوں میں
چشمِ نمناک میں اُگی بارش
پھر بڑی دیر تک ہوئی بارش
دل سمندر سے بن گیا صحرا
تو نے بخشی نہ پیار کی بارش

ارشد محمود ارشد کی شاعری میں فنی چابکدستی اس کے دورِ آفرنیش سے ہی نظر آتی ہے۔ وہ ایک سادہ بات کو شاعرانہ پیرائے میں سادگی مگر پرکاری سے بیان کرنے کے فن میں مہارت رکھتا ہے۔اس کی شاعری میں رومانیت، حساسیت، جذباتیت اور گداز ایک انفرادیت لیے ہوئے ہے۔اس کا مطالعہ اور مشاہداتِ زندگی اس کی شاعری میں اس کی زات کی پرتیں کھولتے ہیں۔ وہ ایک دم کا شاعر نہیں بلکہ آہستہ آہستہ کا شاعر ہے۔ وہ دھیما ہے، تحمل مزاج ہے اور دھیرے دھیرے اس کی شاعری کے معانی و مطالب آشکار ہوتے ہیں تو لگتا ہے کہ شاعر اپنی بات کہہ گیا۔ ارشد محمود ارشد کی شاعری کا یہی انداز منفرد ہے کہ ایک دو بار میں اس کی بات نہیں کھلتی، اس کے شعروں پر اسرار و رموز کی کئی پرتیں چڑھی ہوتی ہیں جو مرحلہ وار اترتی ہیں۔

شب کے پہلو میں جب تو سو جائے
ایک دنیا ہے جاگتی سورج

یوں ہم دیکھتے ہیں کہ ارشد محمود ارشد کے ہاں خارجی مضامین کے ساتھ ساتھ داخلی واردات کا عمل کہیں زیادہ ہے۔ ارشد داخلیت اور خارجیت کے امتزاج سے شعر کو وہ حسن دیتا ہے کہ پڑھنے والا واردات کو اپنے دل پر محسوس کرتا ہے

اسے میں راز داں کرنے لگا تھا
لپٹ کے رو پڑی دیوار مجھ سے
زباں کی سچ سے قربت بڑھ رہی ہے
خفا سب ہو گئے ہیں یار مجھ سے

ارشد محمود ارشد کی شاعری میں فنی پختگی، روایت و جدت کا حسین امتزاج، مطالعاتی و مشاہداتی وفور، سادگی و سچائی، وجدانی کیفیات، اخلاقی اقدار کی پاسداری، معاشرتی فلاح کا رجحان، نفرت سے نفرت اور کائنات کے زرے زرے سے محبت اور عشق کا پیغام واضع طور پر محسوس کیے جا سکتے ہیں۔

ربِ جلیل سے دعا گو ہوں کہ ارشد محمود ارشد کا خود پر اعتماد اور فن پر مہارت اسے ان منزلوں کی طرف لے جائے جن کی اس کے دل میں تمنا ہے اور یہ منزلیں یقیناً اُس کا انتظار کر رہی ہیں

زمانہ خوف کھاتا کس لیے ہے
فقط محراب ہے میری جبیں پر

بساطِ زیست ایک مطالعہ

عادل یزدانی۔۔چینوٹ

جناب ارشد محمود ارشد کے تازہ مجموعۂ کلام "بساطِ زیست" کا مطالعہ میرے لیے جہاں ایک خوشگوار حیرت کا باعث بنا وہاں اس امر کا اندازہ لگانے میں ممد ثابت ہوا کہ اردو شاعری لسانی حوالے سے اظہار و بیان کی جن تبدیلیوں سے گزر رہی ہے وہ کتنا پھیلاؤ اختیار کر چکی ہیں۔مرکباتِ اضافی و عطفی کے بے محابا استعمال سے نجات پانے اور مفرد الفاظ کے ذریعے شعر کی تخلیق و تشکیل کا رجحان "بساطِ زیست" میں بھی نظر آتا ہے۔معدودے چند مقامات پر جناب ارشد محمود ارشد نے غیر محسوس طور پر قدیمی طرزِ اظہار کو اپنے کلام میں جگہ دی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنابِ شاعر، شعر و سخن کی وادی میں داخل ہونے کے بعد اپنے گرد و پیش سے ناآگاہ یا بے بہرہ نہیں تھے اور وقت کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے اپنی الگ پہچان بنانے کی ثمر بار کوششوں میں دلجمعی سے مشغول و مصروف ہیں۔میں جناب ارشد محمود ارشد کی شاعری میں کہیں کہیں جھلکارے مارنے والے مرکب الفاظ کو ان کی آنکھوں میں ناچنے والی شرارت سے تعبیر کروں گا اور انھی کے الفاظ میں ان سے مخاطب ہو کر کہوں گا کہ

ترے طرزِ تکلّم میں نہیں ہے
جو آنکھوں میں شرارت ناچتی ہے

زندگی کی کہانی میں زندہ دِل آدمی کا کردار کتنی اہمیت کا حامل ہے سب جانتے ہیں مگر جب اسی اہم ترین کردار کے ساتھ کہانی میں بہیمانہ قسم کا برتاؤ ہوتا ہے، اسے مسخ کرنے یا اسے مارنے کی کوشش کی جاتی ہے تو خود کہانی کے کردار کا تو معاملہ ہی الگ ہے یقیناً ایک حسّاس قاری کے دل پر بھی قیامت گزر جاتی ہے۔مجھے علم نہیں کہ زندگی کی کہانی میں بطور ایک زندہ دِل کردار کے، جناب ارشد محمود ارشد کے ساتھ کیا سلوک ہوا مگر "بساطِ زیست" میں جگہ جگہ کہانی اور کردار کی نسبت سے کہے گئے متعدد اشعار حتٰی کہ "کہانی میں" ردیف کے ساتھ ایک مکمل غزل کی موجودگی اس امر کی شاہد ہے کہ جناب ارشد محمود ارشد کے ارد گرد کا ماحول ان کے لیے کبھی سازگار نہیں رہا۔میرے نزدیک تلخیِ دَوراں کا سامنا کرنے کی سزا انھیں دوسروں سے مختلف ہونے کی بِنا پر نہیں ملی کہ قریباً ہر آدمی دوسروں سے مختلف ہوتا ہے بلکہ انھیں یہ سزا ایک ایسے منفرد، حساس اور نمایاں شخص ہونے کی بنا پر ملی جو کامیابی سے شہرت واثبات کے زینے چڑھتا دکھائی دے رہا ہے۔کہانی اور کردار کے تعلق سے جناب ارشد محمود ارشد کے کہے ہوئے سارے اشعار ان کے تلخ تجربات اور مشاہدات کا آئینہ ہیں۔

کہانی انتہا تک آ گئی ہے
کہیں آیا نہیں کردار میرا
کہانی کس طرف کو چل پڑی ہے
سبھی کردار مرتے جا رہے ہیں

کوئی کردار جب نہیں باقی
کس طرح مَیں رہوں کہانی میں

میں جناب ارشد محمود ارشد کے حوالے سے کی گئی اپنی گفتگو کی تائید میں مزید چند امثلہ پیش کرنا چاہتا ہوں وہ ان امثلہ میں مختلف پیرائیوں میں اپنے ارد گرد کے لوگوں سے مخاطب ہیں اور الفاظ کے رنگین لبادوں میں چھپائی گئی سنگین کہانیاں بیان کرتے ہیں۔

جب ہم دونوں مٹّی سے تخلیق ہوئے
پھر تم میں کیا ایسی بات نرالی ہے

مداری بس تماشا کر رہا تھا
مگر بچّہ جمورا مر رہا تھا

مَیں بھی سخن شناس ہوں کچھ حق مجھے بھی دے
شہرِ ادب کو باپ کی جاگیر مَت سمجھ

بینائی کا فیصلہ ہونے والا ہے
مَیں نے اِک سورج سے آنکھ مِلا لی ہے

وہ کرگس کی اطاعت کر رہا ہے
جسے شہباز ہونا چاہیئے تھا

آگ بھڑکے گی ذرا دیر تو ٹھہرو ارشد
ہم نے سُورج کے مقابل میں ہے شیشہ رکّھا

وہ جس کو مَیں نے تھی پہچان بخشی
وہی کرتا ہے اب انکار میرا

اُس نے مِری غزل بھی یُوں لکّھی بیاض میں
ہر شعر جُوں کا تُوں رہا مقطع بدل گیا

سب کو دشمن بنا لیا ارشد
تیرے جیسا بھی سَر پھرا کوئی ہے

میرا خیال ہے کہ ان اشعار سے جھلکتی کہانیاں ہر چھوٹے بڑے ادبی مرکز یا مضافات کا درجہ رکھنے والے علاقہ جات کی ادبی تنظیموں کا خاصہ ہیں سو اہلِ دانش و بینش کے سامنے ان کی مزید تشریح کی ضرورت نہیں —ذاتی حوالے سے تلخ حقیقتوں کا بیان بھی اگرچہ ہماری فکری و عملی بے سمتی و ناہمواری کا اظہاریہ ہوتا ہے مگر اجتماعی مصائب و مسائل اور تکالیف و مشکلات کا بیان صاحبانِ دل کو شاعر کے بیانیے سے بے نیاز و بے اعتنا نہیں رہنے

دیتا–آپ اسے توجہ طلبی کا شاخسانہ کہیں یاجنابِ شاعر کے دل کی آواز، بہر صورت جناب ارشد محمود ارشد کے یہ اشعار ان کے اصلاحِ احوال کے جذبے کے عکّاس ہیں –

پھر اُس کے بعد ہی دیتا ہے کام کی اُجرت
ہمارے خُون سے پہلے وہ زر نکالتا ہے
بُوڑھے پیڑ کی چھاؤں کیسے بانٹو گے
آنگن میں دِیوار اُٹھانا ٹھیک نہیں
شبِ سیاہ میں جگنو بھی اک غنیمت ہے
ذرا سا حوصلہ اندر کا ڈر نکالتا ہے
محشر میں کام آئیں گے اعمال ہی ترے
نام و نسب کو باعثِ توقیر مت سمجھ
اُس کا وعدہ ہے رزق دینے کا
بُھوکے سوتے ہیں کب پرندے بھی

انسان اس کائناتِ بسیط کا جزوِلازم بھی ہو اور اس سے جذباتی وابستگی بھی نہ رکھے یہ قطعی طور پر ناممکن ہے جبکہ شاعر ہو یا سائنسدان اس کائنات کو سمجھنے، اس کے تناظر میں حقیقت مطلقہ تک پہنچنے کی جستجو میں لگے رہنے کے علاوہ جہاں اپنے آپ کو اس کے مطالبات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں وہاں اس کی رنگارنگی سے لطف وانبساط کشید کرتے ہیں–اور یہ لطف اندوزی محض بحر و بر، دشت و صحرا، کہستان و میداں، گُلزار و سبزہ زار کے سیر سپاٹے تک محدود نہیں ہے آسمان وزمیں، ابر و باد، شمس و قمر، کہکشاں و سیارگاں کو بہ نگاہِ سرسری دیکھنے کا نام نہیں ہے بلکہ اپنے اندر کی کائنات کو اس کے حوالے سے دریافت کرنے کا نام ہے سو جناب ارشد محمود ارشد جب مظاہرِ کائنات کو بطورِ استعارہ اپنی شاعری میں جگہ دیتے ہیں تو اصل میں وہ دریافتِ ذات کے عمل سے گزر رہے ہوتے ہیں اور بلاشبہ وہ اس عمل سے نہایت خوبصورتی سے گزرتے ہیں ملاحظہ فرمائیں –

سب کے سب ہیں مرے قبیلے سے
چاند، جگنو، ہَوا، دِیا، سُورج
خُود اندھیروں میں ڈُوب جاتا ہے
اِن اُجالوں کو بانٹتا سُورج
لوگ رستہ ہی بھٹک جاتے ہیں
یہ محبت بھی ایک جنگل ہے
کوئی تو سانحہ گزرا ہے اُس پرندے پر
کہ آدھی رات کو جو گھونسلے سے باہر ہے

کوئی مہتاب پانی میں گِرا ہے
نَدی کِس بات پر اِترا رہی ہے

جناب ارشد محمود ارشد کا اکثر کلام سہلِ ممتنع میں ہے مگر بعض مقامات پر وہ اس صفتِ سخن کا کمال مہارت سے مظاہرہ کرتے ہیں جیسے

مِرے مالک عطا کچھ اور بھی ہو
مُقدّر سے ضرورت بڑھ گئی ہے
سجا کر کھیل سارا اِس زَمیں پر
بسیرا کر لیا عرشِ بریں پر
اک نظر کا سوال ہے بابا
درپہ کاسہ لیے کھڑا کوئی ہے
دِل میں پالا ہے یُوں تُمھارا دُکھ
جیسے جِینے کا ہو سہارا دُکھ
اُس کے کان کی بالی بھی
میری باتیں کرتی ہے

جناب ارشد محمود ارشد نے اپنی شاعری میں زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کیا ہے جس کے نتیجے میں خالصتاً شادی شدہ زندگی کے گھریلو معاملات بھی ان کی غزل میں در آئے ہیں - یہ آخری گفتگو ازراہِ تفنن بھی ہے اور اشعار کے تناظر میں مبنی بر حقیقت بھی۔

یہ سب تیرے بعد ہوا ہے
گھر کا کچرا دیکھ رہی ہو؟

مَیں اِک مصرع سوچ رہا ہوں
تُم چاہو تو سو سکتی ہو

بساطِ زیست اور شاہینوں کا شہر

عروبہ عدنان

شاہینوں کا شہر سرگودھا اور پھر اس شہر کی زرخیز مٹی، جس پر ہر پاکستانی کو بجا طور پہ فخر ہے۔اس شہر کی زرخیز سرزمیں نے اردو ادب کو بہت سے مایہ ناز دانشور، معروف شعراء اور قلمکار دیئے۔انہیں میں ایک منفرد لب ولہجہ کے مالک ارشد محمود ارشد صاحب بھی ہیں۔

ارشد جی کی شاعری میں ہمیں حسن ظاہری و باطنی دونوں ہی بخوبی نظر آتی ہے۔ للٰہذا یوں کہنا چاہیئے کہ وہ حسیات کے انتہائی حساس شاعر ہیں۔اس سمے ہمارے ہاتھ میں ان کا شعری مجموعہ "بساط زیست" ہے۔ واااہ کیا ہی حسین اندازِ بیاں ہے اس جواں فکر شاعر کا، کیا والہانہ وابستگی ہے فطرت سے۔کتاب کب شروع کی اور کب ختم ہوئی شاید بیچ کا عرصہ دو دن کا رہا مگر جہاں سے پڑھنا بند کیا اور جہاں سے پھر شروع کیا تو فوری ربط اور تسلسل جڑ گیا شاید اس کی وجہ یہ کہ ارشد صاحب کے کلام میں زندگی سانس لیتی نظر آئی۔۔فطرت سے اور زندگی سے محبت ہی شاید ارشد محمود ارشد صاحب کی خوبصورت شاعری کی اصل وجہ ہے۔جسکا بخوبی اندازہ ارشد صاحب کے اس شعر سے لگایا جا سکتا ہے کہ

اس لئے سر پہ یہ اٹھایا ہے غم کا سورج
دھوپ پڑتی ہے تو پیڑوں پہ ثمر آتا ہے

واااہ، بیحد خوبصورت فطری اظہار اس شعر میں نظر آئے ہے اور یہی ارشد صاحب کی شاعری کا خاصہ ہے۔ وہ پھولوں، پیڑوں سے، پربت، ندیوں سے باتیں کرنے والے فطری شاعر ہیں جنھیں اظہار کا ڈھنگ شاید اس زرخیز مٹی نے دیا ہے جو ارشد محمود ارشد صاحب کی جائے پیدائش ہے۔ارشد صاحب کے چار شعری مجموعے چھپ چکے ہیں جن کی ترتیب کچھ یوں بنے ہے۔1_ عجب سی بے قراری۔2_ کبھی میں یاد آوں تو۔3_ شام کی دہلیز پہ۔اور۔4_ بساطِ زیست۔ ادبی سفر میں انہیں بہت سے اعزازات وایوارڈز سے بھی نوازا گیا۔۔جو کچھ اس طرح رہے ورلڈ پیس اینڈ لیٹریری ایوارڈ۔۔۔ریشم رائٹر ایوارڈ 2014۔۔ نقیبِ کاروانِ ادب ایوارڈ 2014۔۔روزن شیلڈ 2014۔۔ریشم رائٹر ایوارڈ 2015۔۔ریشم رائٹر ایوارڈ 2016۔۔۔ریشم رائٹر ایوارڈ 2017

اب ہم ارشد صاحب کی اس کتاب سے کچھ انتخاب آپ احباب کی نذر کرتے ہیں جو اس سمے ہمارے ہاتھ میں ہے یعنی "بساطِ زیست" سے کچھ شعری انتخابات

کٹتے ہی ڈور سانس کی نام و نمود خاک
ہونا ہے ایک روز یہ قصرِ وجود خاک
ٹوٹا کسی کا دل جو گرا دوسری طرف
میزان میں پڑا تر ارختِ سجود خاک
تجسیم کر رہا ہے وہ دستِ کمال ہے

آتش پرست، دہرے، مسلم ہنود خاک
اس محفلِ طرب میں نہیں چاشنی کوئی
دل میں رمق نہ ہو اگر بزمِ سرود خاک
بڑھنے لگے ہیں چار سو رسموں کے دائرے
ٹھوکر لگا کے پاؤں کی کر دوں قیود خاک
یہ قوم ان ہی راستوں پہ چل پڑی ہے پھر
جن پہ ہوائیں تھیں ایک دن عاد و ثمود خاک
سینے میں کوئی آگ ہے ارشد لگی ہوئی
ورنہ ہماری آنکھ سے اٹھتا ہے دود خاک

عورت

بنایا ہے مصور نے حسیں شہکار عورت کو
الگ پہچان دیتا ہے کہانی کار عورت کو
وہ ماں ہو، بہن، بیوی، یا کہ بیٹی ہو سنو لوگو
ہر اک کردار میں رکھا گیا غم خوار عورت کو
یہی سچ مچ بنا دے گی ترے گھر کو حسیں جنت
ذرا تم پیار سے کرنا کبھی سرشار عورت کو
پھر اک دن ان کی قسمت میں لکھی جاتی ہے رسوائی
زمانے میں سمجھتے ہیں جو کاروبار عورت کو
اسی کا روپ دھارے پھر رہی ہیں کچھ چڑیلیں بھی
میں عورت ہی نہیں کہتا کسی مکار عورت کو
سلام ان عورتوں پر جو کہ مائیں ہیں شہیدوں کی
سلامی پیش کرتا ہوں میں سو سو بار عورت کی
مجھے اس وقت ارشد کیوں مری ماں یاد آتی ہے
کسی کٹیا میں دیکھوں جب کسی نادار عورت کو

ارشد محمود ارشد صاحب کا شعری سفر جاری و ساری ہے ماشاء اللہ اور ہمیں امید ہے کہ مستقبل قریب میں ہم مزید ان کے شعری مجموعے پڑھیں اور کامیابیاں دیکھیں گے ۔ مستقبل کے لیے بہت سی نیک تمنائیں اور دعائیں

بساطِ زیست ـــ سرد موسموں میں حرارت

پروفیسر سید مرتضیٰ حسن ۔۔ سرگودھا

آئیے آج حسن و جمال کی باتیں کریں۔آئیے کہ آج محبت اور خوابوں کے قصے چھیڑیں۔شاعری، جذبے اور لفظ کو موضوع بنائیں۔جب میں ادب و شاعری پر غور کرتا ہوں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ شاعری کے دیگر وظائف کے ساتھ ساتھ ایک اہم وظیفہ یہ بھی ہے کہ وہ انسان کے اندر جمالیاتی زاویۂ نظر پیدا کرتی ہے۔ لہٰذا جمال کی خوشبو سے لبریز ہو کر انسان قصرِ کائنات کے جس گوشے کی جانب بھی جھانکتا ہے تو اس کی آنکھوں کی روشنی کے تمام رنگ محبت کے چشمے سے پھوٹتے ہوئے نکھرے نکھرے دیکھائی دیتے ہیں۔یہ روشنی انسان کو انسانیت، خوبصورتی، محبت، مروت، امن، لفظ اور خوشبو کے احساسات کی طرف کھینچتی ہے اور انسان اس کے سامنے بے بس ہوتا چلا جاتا ہے۔اگرچہ اس بے بسی اور لاچاری میں بھی کس قدر مختاری اور اختیار ہے یہ ایک الگ موضوع ہے۔انسانی جبلت پر توجہ کی جائے تو یہ پہلو قابلِ ذکر ہے کہ انسان اپنی شناخت کا خواہاں رہا ہے۔اس شناخت کی نوعیت کا انحصار اس کے مزاج، ماحول، زاویہ نظر اور علمی استعداد پر ہے۔

مجھے اس بات کی بے حد خوشی ہے کہ میرے دوست ارشد محمود ارشد نے شعر و سخن کو اپنی شناخت کا ذریعہ بنایا ہے اس نے اپنی پہچان کے لیے لفظ، احساس، اور خوشبو کا انتخاب کیا ہے۔اس نے خیالوں اور جذبوں کو اہمیت و فوقیت دی ہے۔

ارشد محمود ارشد ایک سچا شاعر ہے۔اس کی شاعری اپنے باطن میں مختلف نوعیت کے ڈھیروں موضوعات سمیٹے ہوئے ہے۔اس نے اپنی ذات اور پھر ذات سے بڑھ کر اپنے ارد گرد بکھرے ہوئے بہت سے موضوعات کو مس کیا ہے۔اس کا زاویہ نظر اور پیرایۂ اظہار خاصا مضبوط، توانا اور دلکش ہے. لہٰذا اگر اس کی شاعری اور فکر و فن پر تفصیلی بات کرنا مقصود ہو تو اس کے لیے خاصا وقت درکار ہے۔

اگر ہم مجموعی طور پر ارشد محمود ارشد کی شاعری کا تجزیہ کریں تو یہ امر خاصا واضح ہے کہ ارشد نے اپنی لفظیات اور حسیات کو رومانوی رکھا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ مختلف سماجی موضوعات کو بھی عصری شعور کے آئینے میں۔دیکھا ہے۔اس کی اپنے معاشرے کے ساتھ جڑت بہت جاندار ہے مگر اس ضمن میں اس نے اپنے فن کے جمالیاتی پیرہن کو داغدار نہیں ہونے دیا۔اس کا مزاحمتی رویہ اور سماجی صورتِ حال کے سبب پیدا ہونے والا تخلیقی ردِ عمل کسی مقام پر بھی نعرے کی شکل اختیار نہیں کرتا۔اس حوالے سے چند اشعار دیکھئے۔۔۔

زمیں کی خاک کبھی آسماں نہیں چھوتی
مجھے تھی اس کی خبر زائچے سے پہلے بھی

ذرا سی دور لیٹروں کی ایک بستی ہے
گزر چکا ہوں میں اس راستے سے پہلے بھی

نجانے کون سی جنت کی جستجو ہے تجھے
کہ جس کے واسطے جینا مرا حرام ہوا

اچھی شاعری کی ایک بنیادی شرط یہ بھی ہے کہ اس کی بنیاد جذبے اور احساس پر استوار ہو۔اگر شاعری میں

مٹھاس، رچاؤ اور چاشنی کے رنگ معدوم ہو جائیں تو اس کا جمالیاتی تاثر قائم نہیں رہ پاتا۔ ارشد محمود ارشد کی شاعری کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ ہمیں اس میں احساسات کی بنیادوں پر اٹھائے گئے اشعار کی کثیر تعداد ملتی ہے یعنی ارشد محمود احساس کی سطح پر مصرع سازی اور شعری بُنت کے فن سے بخوبی آگاہ ہے۔ وہ غزل کی تہذیب اور شعری ثقافت کے پیمانوں سے واقف ہے۔ اس شعری تناظر میں ارشد کی شاعری ایک ایسی حسین وادی ہے جہاں محبت کے گل بوٹے پھوٹتے ہیں۔ پاکیزہ اور پر کیف عشق کی سرشاریاں، ہجر و فراق کے جھونکے اور حسن و جمال کے دل نشیں نغمے بکھرتے ہیں۔ ارشد کے چند اشعار کے کیف کی پھواریں اور لذت کا سحر دیکھئے۔

گھنے درخت کے سائے میں جب قیام ہوا
میں پہلی بار پرندوں سے ہم کلام ہوا

بچا کے لایا تھا جنات سے میں شہزادی
اسی کے ساتھ کہانی کا اختتام ہوا

عجیب کیف میں ڈوبی تھیں انگلیاں ارشد
کسی کا لمس مری عمر بھر کا جام ہوا

ایسی شاعری جس میں لفظ کا تخلیقی استعمال اور عصری حسیت کا لمس موجود ہو وہ کامیاب شاعری کہلاتی ہے۔ ارشد کی شاعری اس اعتبار سے بھی معتبر ہے کہ اس میں یہ اوصاف بھی بدرجہ اتم موجود ہیں۔

آج کے انسان کا المیہ، تنہائی، عدم تحفظ، غیر متوازن نفسیاتی کیفیات اور جدید انسان کو درپیش دیگر مسائل کا اظہار اس کے یہاں خوب صورت تخلیقی پیرائے میں ڈھل کر منظرِ عام پر آتا ہے۔

شبِ سیاہ میں جگنو بھی اک غنیمت ہے
ذرا سا حوصلہ اندر کا ڈر نکالتا ہے

ارشد مجھے تو غیب سے آتی ہے اب صدا
ابنِ تراب اب تری مہلت تمام شد

آج کل کی شاعری میں ایک غلط چلن جو کہ عام ہوتا چلا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ اکثر شعرا اپنی آس پاس کی زندگی کے ادراک سے عاری ہیں، اس کے علاوہ اجنبی الفاظ کے بے ہنگم اور غیر منطقی استعمال کو فروغ مل رہا ہے۔ کسی حد تک یہ سمجھا جانے لگا ہے کہ وقتی طور پر چونکا دینے والا شعر ہی جدید اور بڑا شعر ہے۔ جبکہ حقیقت اس کے بر عکس ہے۔ میرے خیال میں بڑا شعر وہ ہے جو احساس کی آنچ میں پگھل کر دل کے راستے روح تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ شعر کی تاثیر کا لازوال لمحہ وہ ہے جب قاری اس کی کیفیت میں ڈوب جائے اور اس تخلیقی تجربے کو محسوس کرنے لگے۔ اس بلندی تک اُڑان کا اذن انہیں تخلیق کاروں کو نصیب ہوتا ہے جو فیشن اور تصنع سے خود کو دور رکھتے ہیں۔ نئے دور سے خود کو منسلک رکھنے کے لیے پرانے دور کا مطالعہ اور روایت کا شعور از حد ضروری ہے۔ ارشد کے کچھ اشعار دیکھئے۔۔

لمبا سفر تھا آبلہ پائی تھی دھوپ تھی
میں تھا تمہاری یاد کا سایہ تھا اور بس
اس کارزارِ زیست میں ہم نے تمام عمر
ارشد کسی کا عشق کمایا تھا اور بس

ہمیں ارشد کی شاعری میں روایت و جدت کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ اس کے اسلوب میں روایت کی مٹھاس اور جدت کی ترنگ ہر دو کا ذائقہ موجود ہے۔

پیچھا کرتے کرتے اک آوازے کا
شب نے سینہ چاک کیا دروازے کا
کوزہ گر نے پہلے کیا تخلیق کیا
سارا کھیل تماشا ہے اندازے کا

ارشد محمود کی مذہبی شاعری کا جمالیاتی پہلو بھی خاصا روشن ہے۔ انہوں نے مذہبی شاعری میں بھی خود کو منفرد رکھنے کی سعی کی ہے۔ مذہبی یا نظریاتی شاعری کا ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اس میں معنوی ترسیل تو سہل ہے مگر جمالیاتی و تخلیقی ترسیل کے ہونٹ تشنہ رہ جاتے ہیں۔ لہٰذا اس صورتِ حال میں شاعرانہ ماحول کو قائم رکھنا ایک تخلیقی امتحان سے کم نہیں۔ ارشد اس آزمائش پر بھی پورا اترتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے سلام کے چند اشعار دیکھئے۔

پہلے سوچ کے دھارے ماتم کرتے ہیں
اور پھر ہم تصویر ترا غم کرتے ہیں
ان لوگوں کی بینائی بڑھ جاتی ہے
تیری یاد میں جو پلکیں نم کرتے ہیں
متاعِ زیست لٹاتا نہیں کوئی ایسے
یہ صرف جوش نہیں دلبری حسینؑ کی ہے

ارشد کا کمال یہ ہے کہ اس نے جو کچھ کہا ہے اپنا کہا ہے اس کے اشعار اس کی حقیقی خوشبو اور اس کے لفظ اس کا دائمی نقش ہیں۔ یہ بات روزِ روشن کی مانند عیاں ہے وہ شعر کہنا جانتا ہے اور اس کے یہاں بے حد تخلیقی امکانات موجود ہیں جو کہ کسی بڑے تخلیق کار کا اثاثہ ہوتے ہیں۔ میں اس کے کامیاب شعری سفر کے لیے دعا گو ہوں۔ آخر میں بس ایک بات کے ساتھ آپ کی زحمتیں تمام کروں گا کہ اگر آپ منجمد اور سرد موسموں میں محبت، خلوص، مٹھاس اور سچائی کی حرارت محسوس کرنا چاہیں تو ارشد محمود ارشد کی شاعری کو پڑھیں آپ کو میری باتوں کا یقین آجائے گا۔

بساطِ زیست کا تجزیاتی مطالعہ

خواجہ اعجاز احمد بٹ

اُنیسویں صدی میں ادبی مراکز میں احساس برتری کا جنوں ایسا تھا کہ دور دراز علاقوں کے تخلیق کاروں کو مقامی، مضافاتی یا چھوٹے شہروں کے ادیب کہہ کر ادبی سکون محسوس کیا جاتا تھا۔ سترھویں صدی کے انگریزی ادب میں لندن سے ادباء کو سکاٹ لینڈ، آئرلینڈ کے ادباء کو کم درجہ دیا جانے لگا۔ ایسے سکاٹش ادیبوں نے سر والٹر سکاٹ، آئرش ادیبوں نے ویلیم بٹلر، W.B. Yeats کو قومی شاعر بنانے کا اعلان کیا۔ 1947 سے پہلے یعنی پاک بھارت آزادی سے قبل۔۔۔ اگرچہ دبستانِ لکھنو، دبستانِ دہلی، دبستانِ رام پور اور پھر کسی حد تک دبستانِ لاھور کا چرچا تھا۔ مگر آزادی کے بعد ریڈیو اور اخبارات کے مرکز ھونے کی وجہ سے لاھور کو ادب کا مرکز قرار دے کر باقی علاقوں کے ادیبوں کو مضافاتی ادیب کہنا شروع کر دیا گیا۔

ردِ عمل کے طور پر دبستانِ لاھور کے مقابلے میں دبستانِ کراچی بھی منظرِ عام پر آیا۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے دبستانِ سرگودھا کا خاکہ پیش کیا (اگرچہ بعد میں وہ اس سے انکاری ہو گئے) مگر میری تحقیق کے مطابق ماہنامہ کامران کی فائلوں میں انور گوئندی نے سکول آف سرگودھا کا ذکر کیا ہے۔ لہذا وہی اس سکول آف تھاٹ یا دبستان کے دریافت کنندہ ہیں۔ سرگودھا، جہلم اور چناب کے درمیاں خطے میں واقع ھونے سے دونوں دریاؤں کا اثر یہاں کے باسیوں خصوصاً ادیبوں پر نمایاں ہے۔ اگرچہ ماضی میں احمد ندیم قاسمی، حافظ یوسف آزاد، ڈاکٹر وزیر آغا، غلام جیلانی اصغر، انور گوئندی اور رشک ترابی اس قافلہ ادب کے مسافر رہے ہیں مگر اب بھی ادب کے سوتے خشک نہیں ہوئے۔ اب بھی ڈاکٹر شیخ محمد اقبال، یوسف خالد، افضل گوہر راؤ، شاکر کنڈان، ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم، ڈاکٹر عابد سیال، ڈاکٹر شفیق آصف، خالد یوسفی، نجمہ منصور، ثمینہ گل، منزہ گوئندی، ذوالفقار احسن، ڈاکٹر عابد خورشید اور عاشر وکیل راؤ اس شعری روایت کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ اور جب اس چمن سے ارشد محمود ارشد کا چوتھا شعر مجموعہ کلام بساطِ زیست نظر نواز ہوتا ہے تو مسرت بھی ہوتی ہے اور طمانیت بھی کہ سرگودھا میں شاعری ابھی زندہ ہے۔ اگرچہ ارشد محمود ارشد کی بساطِ زیست غزلوں پر مشتمل ہے مگر اس میں موضوعات کا تسلسل بھی ہے محبت ایک عالمگیر جذبہ ہے جو قدیم اور جدید شعراء کا موضوعِ سخن رہا ہے کبھی یہ بند لبوں کی دہلیز پر آکر دم توڑ دیتا ہے اور کبھی یہ جذبہ موجود حسیات اور لمس کی حد تک پہنچ جاتا ہے مگر ارشد محمود ارشد نے جدید لہجے میں زندہ لوگوں کے جذبات کی عکاسی کی ہے۔

دل سمندر سے بن گیا صحرا
تُو نے بخشی نہ پیار کی بارش

ترے دم سے ہے رونق جسم و جاں کی
وگرنہ اُڑ رہی تھی خاک مجھ میں

لوگ رستہ بھٹک ہی جاتے ہیں
یہ محبت بھی ایک جنگل ہے

تُو جہاں پھینک کر گیا تھا مجھے
دیکھ اب بھی وہیں پڑا ہوں میں

اسی کا پوچھتا ہوں ہر گزرنے والے سے
ترا مکان کہ جو اس گلی میں تھا ہی نہیں

مگر ارشد کے اشعار محض محبت کے لافانی جذبے کی عکاسی تک محدود نہیں۔اس کی غزلوں میں سماجی شعور کی عکاسی، معاشرے میں پھیلی ہوئی نفرت، طبقاتی کشمکش اور معاشرے کی اصلی تصویر بھی ہے

مداری بس تماشا کر رہا تھا
مگر بچہ جمورا مر رہا تھا

وہ جو فٹ پاتھ پر اوندھا پڑا ہے
کبھی اس شخص کا بھی گھر رہا تھا

رعایا نیند سے بیدار ہو گئی جب بھی
تو پھر یہ ظلم کی سرکار گرنے والی ہے

ایک راہزن نے لوٹ لی ارشد
دن کی ساری کمائی رستے میں

ارشد کی شاعری کا اسلوب جدید بھی ہے اور عام فہم بھی جس سے قاری کو ابلاغ کے مسئلے کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ جدیدیت کے اس دور میں ارشد کی غزلوں میں غالب اشعار ایک نئے استعارے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔اور یہ استعارہ پرندہ، شجر، بوڑھا پیڑ، پھول، تتلیاں، گھونسلا، اُڈاری، کونج، سایہ ہے۔ دراصل آج کل کی مصروف ترین معاشی جدوجہد جس میں ملکی اور بین الاقوامی و بااعلیٰ حاکمیت کی خواہشات، جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنے والی اقوام کو زیرِ تسلط کی خواہش سب سے زیادہ ایک فرد کا اپنے خاندان کے یونٹ سے کٹ کر معاشی طور پر علحیدہ جزیرے کی خواہش کرنا۔۔۔ یہ انسان فطرت سے کٹ کر رہ گیا ہے۔ انیسویں صدی کے یورپی صنعتی ترقی نے ورڈز ورتھ، کولرج و دیگر شعرائے کرام کو فطرت کے اندر جھانکنے اور اس سے دوستی کرنے کی کاوش میں مصروف تھے۔ اردو ادب میں بہت سے شعراء ساتھ خوشی محمد ناظر اور علامہ اقبال کی بانگِ درا میں ابتدائی نظمیں اور

باقیاتِ اقبال (مرتبہ عبدالواحد معینی اور عبداللہ قریشی) میں شائع شدہ نظمیں شاعر اور فطرت کو ہم آھنگ کرتی نظر آتی ہیں مگر ارشد محمود ارشد کا فلسفہ یہ ہے کہ پیڑ اور بوڑھے پیڑ کو خاص کر علامت کے طور پر پیش کیا ہے

کہ بوڑھے پیڑ کے تیور بدلنے لگتے ہیں
کہیں جو گھاس کا تنکا بھی سر نکالتا ہے

گھنے درخت کے سائے میں جب قیام ہوا
میں پہلی بار پرندوں سے ہمکلام ہوا

اسی کے ہاتھ پر بیعت میں کر کے آیا ہوں
جو بوڑھا پیڑ کڑی دھوپ میں کھڑا ہوا ہے

بوڑھے پیڑ کی چھاؤں کیسے بانٹو گے
آنگن میں دیوار اُٹھانا ٹھیک نہیں

چمکی یوں سرخ دھوپ کہ نقشہ بدل گیا
پل بھر میں ایک پیڑ کا سایہ بدل گیا

عجیب سانحہ گزرا ہے شب کے پچھلے پہر
شجر اُداس ہیں پنچھی بھی گھونسلوں میں نہیں

ارشد کے نزدیک پیڑ آج کا انسان ہے جو خاندان کے بزرگ کا رول ادا کرتا ہے کبھی یہ پیڑ جو برگد بن چکا ہے سکون کی علامت کے طور پر سامنے آتا ہے جب اس کے سائے میں شاعر بیٹھ کر سکون کی لہروں یعنی پرندوں سے ہم کلام ہوتا ہے اور کبھی وہ پیڑ کو ہمارے معاشرے کا ایک یونٹ یعنی خاندان کا شیرازہ بکھرتے نہیں دیکھ سکتا یعنی وہ اس کی چھاؤں بانٹتے نہیں دیکھ سکتا جب پرندے شجر پر یا شجر میں نہیں ہوتے تو شجر اداس ہو جاتا ہے وہ برگد کو زندگی کی تلخیوں، تکالیف اور کرب وبلا کے باوجود حوصلہ مند دیکھتا ہے تو پکار اُٹھتا ہے

جو بوڑھا پیڑ کڑی دھوپ میں کھڑا ہوا ہے
شجر اور برگد کے ساتھ پرندے ہی منسلک ہیں

کوئی تو سانحہ گزرا ہے اس پرندے پر
کہ آدھی رات کو جو گھونسلے سے باہر ہے

کٹ کے جب بھی درخت گرتا ہے
پھڑپھڑاتے ہیں تب پرندے بھی

ادھر آ میں بتاتا ہوں تخیل کس کو کہتے ہیں
اُڑاری اس پرندے کی زمیں سے آسماں تک ہے

پرندے گھونسلوں میں جا چکے تھے
اکیلی کونج ہی کرلا رہی تھی

جب سمجھ آنے لگی مجھ کو پرندوں کی زباں
معترف میری ریاضت کا شجر ہونے لگا

ارشد کے نزدیک پرندہ آج کے انسان کی علامت ہے وہ انسان جو مادی ترقی کی دوڑ میں گم اپنے خاندان سے علحیدہ ھوکر آزاد فیملی یونٹ کے فکر میں گم اور بزرگوں کے تجربے سے فائدہ نہ اٹھاکر موجود فلسفیانہ موشگافیوں میں اُلجھ کر ایک آزاد اور ترقی یافتہ کا روپ دھارنے کی کش مکش میں مصروف ہے ارشد کے نزدیک جب برگد (جو خاندان کے سربراہ کی علامت ہے) حیات و موت کی کش مکش سے آزاد ہو جاتا ہے تو پرندہ(جو کہ خاندان کے فرد کی علامت ہے)معاشرہ میں بے یار و مددگار ہو کر پھڑ پھڑاتا ہے شاعر پرندوں کی زباں سمجھتا ہے یعنی جب انسانوں کے مسائل الجھنوں اور تکالیف کا ادراک کرتا ہے تو وہ شجر اس کی ریاضت یعنی تجربے کا معترف ہو جاتا ہے۔
الغرض ارشد محمود ارشد کی "بساطِ زیست" میں گرچہ غزل کے تمام لوازمات موجود ہیں ۔۔۔۔ جدید لفظیات اور اسلوب کا ادراک بھی مگر سب سے زیادہ ان کی غزلوں کی سادہ بیانی ، سلاست اور قاری کے ساتھ ابلاغ کی آسانی سے یہ مجموعہ کلام موجودہ شاعری میں ایک اہم مقام کا حامل ہے۔

بساطِ زیست

فاخرہ بتول نقوی

شعر زندگی کے تسلسل کی باضابطہ تصویر کا نام ہے۔ ہم دو مصرعوں میں زندگی کی کہانی کو اپنی آنکھوں میں جب چاہیں چلتا پھرتا، ہنساتا، رُلاتا بلکہ گدگداتا دیکھ لیتے ہیں۔ "بساطِ زیست" میرے ہاتھ میں ہے اور ایک باکمال نوجوان شاعر ارشد محمود ارشد کی زندگی کے ورق ورق کو پڑھ رہی ہوں۔ اور خوشگوار حیرت ہو رہی ہے۔ شاعر نے اپنے کلام پر اپنے کمال کو برقرار رکھا ہے۔ لیکن اپنی فیلنگز کو اپنے انداز میں ہی بیان کیا ہے۔ ہم اپنے جذبات کو دوسروں کے انداز میں کیوں بیان کریں؟ اظہار کو خالص رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے، اپنی بات اپنے لفظوں میں بیان کرنا ہی ہنر ہے۔

سلام کے دو اشعار ملاحظہ کیجئے

شعورِ ضبط میں سب آگہی حسین ع کی ہے
چراغِ دین میں یہ روشنی حسین ع کی ہے
انہی کے نام پہ اِسکو لُٹا بھی سکتا ہوں
کہ میرے پاس مِری زندگی حسین ع کی ہے

سیاسی منظر نامے کو سامنے رکھتے ہوئے شاعر کہتا ہے

مداری بس تماشا کر رہا تھا
مگر بچہ جمورا مر رہا تھا
بدن کی ریت اُڑنا چاہتی تھی
میں صحرا آنسوؤں سے بھر رہا تھا

آگے چل کر شاعر کچھ یوں گویا ہوتا ہے۔

ہتھیلی دیکھ کے میری یہ جوتشی نے کہا
ترا نصیب ترے زائچے سے باہر ہے
کوئی تو سانحہ گذرا ہے اِس پرندے پر
کہ آدھی رات کو جو گھونسلے سے باہر ہے

مجھے ارشد محمود ارشد میں ایک ایسا شاعر دکھائی دیتا ہے جو زمین سے رابطہ مضبوطی کے ساتھ برقرار رکھتے ہوئے آسمان کی جانب پرواز کا عزم رکھتا ہے۔۔ بہت سی نیک خواہشات کے ساتھ اجازت

بساطِ زیست کا شاعر

صفدر رشید

ادبی لحاظ سے سرگودھا کی دھرتی بہت زرخیز ہے مستقبل میں جب بھی ادب کی تاریخ لکھی جائے گی تو سرگودھا کے ادباء شعراء اور نثرنگاروں کے بغیر وہ تاریخ ہر لحاظ سے نامکمل اور ادھوری رہے گی جب تک اس میں سرگودھا سے تعلق رکھنے واے اہل قلم کو شامل نہیں کیا جائے گا۔ماضی سے سفر کرتے ہوئے ہم موجودہ دور کے حوالے سے بات کریں تو آج بھی بہت سی ہمہ جہت شخصیات موجود ہیں جن میں پروفیسر ہارون الرشید تبسّم پروفیسر یوسف خالد پروفیسر ڈاکٹر آصف راز پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال پروفیسر شفیق آصف ذوالفقار احسن نسیم اقبال بھٹی کے علاوہ اور بہت سے روشن ستارے آسمانِ ادب پر جگمگا رہے ہیں اور انہی ستاروں میں ایک روشن ستارہ ارشد محمود ارشد بھی ہے۔ارشد محمود ارشد کی شخصیت اور فن پر بات کریں تو ہمیں اس بات کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ارشد ایک ملنسار اور پر خلوص شخصیت کا مالک ہے۔ارشد کو رب العزت نے خوبصورتی اور خوب سیرتی دونوں نعمتوں سے خوب نوازا ہے اور مجھے اس بات فخر ہے کہ وہ میرا ایک اچھا دوست ہے۔ارشد نے اردو ادب میں اپنا مقام بنانے کے لئے بہت ریاضت کی ہے اور آج وہ ایک کہنہ مشق شاعر اور کئی کتابوں کا مصنف ہے اور چار شعری انتخاب بھی شائع کر چکا ہے اور آجکل " پزیرائی" کے لئے دن رات محنت کر رہا ہے۔ارشد کی دیگر تخلیقات میں عجب سی بے قراری ہے ---کبھی میں یاد آوں تو--شام کی دہلیز پر---شامل ہیں اور مرتبہ کتب ---محبت بانٹ لیتے ہیں--- نبی کا قصیدہ -----تمہاری یاد کا موسم--کوئی تعبیر دو مجھ کو--ہیں۔" بساطِ زیست " ارشد محمود ارشد کا چوتھا شعری مجموعہ ہے۔بساطِ زیست کا مطالعہ کریں تو یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ ارشد کے بلا جھجک اپنا مدعا بیان کرنے کی روایت زندہ و سلامت ہے اس نے جو دیکھا اور محسوس کیا اسے برملا کہہ دیا یہی ایک اچھے لکھاری کا کمال ہوتا ھے کہ وہ حالات وواقعات کا ادارک کر کے اسے دوسروں تک پہنچا دیتا ہے۔ارشد معاشرے کا شاعر ہے۔وہ معاشرے کا مشاہدہ کرتا ہے۔جو دیکھتا ہے اسے کھل کر بیان کرتا ہے جیسا کہ وہ کہتا ہے۔

خودی کے زعم میں ایسا وہ مبتلا ہوا ہے
جو آدمی بھی نہیں تھا وہ اب خدا ہوا ہے
وہ کہہ رہا تھا بجھائے گا پیاس صحرا کی
مرا اک ابر کے ٹکڑے سے رابطہ ہوا ہے

اسی طرح چند اشعار اور دیکھیں اور فیصلہ کریں کہ ارشد اس معاشرے کا ہونہار نباض نہیں تو اور کیا ہے

مداری بس تماشا کر رہا تھا
مگر بچہ جمورا مر رہا تھا

وہ جو فٹ پاتھ پر اوندھا پڑا ہے
کبھی اس شخص کا بھی گھر رہا تھا

ارشد کے ہاں تصوف اور بزرگی کا رنگ بھی بہت حد تک نظر آتا ہے جیسا کہ علامہ اقبال نے اپنے رب سے کچھ شکوہ کیا تھا کچھ یہی رنگ نئے انداز میں ارشد کے ہاں بھی ملتا ہے ذرا دیکھیں

سجا کر کھیل سارا اس زمیں پر
بسیرا کر لیا عرشِ بریں پر
زمانہ خوف کھاتا کس لئے ہے
فقط محراب ہے میری جبیں پر

ان دو اشعار میں ارشد نے معاشرے کی بہت بڑی منافقت کو بڑے احسن طریقے سے بے نقاب کیا ہے

اب ایک غزل کے اشعار ملاحظہ فرمائیں

کیوں چھبوتا ہے خار سینے میں
کوئی خنجر اتار سینے میں
اس لے شعر کہنے لگتا ہوں
بڑھ نہ جائے غبار سینے میں
آگ پھر سے بھڑک بھی سکتی ھے
کچھ دبے ہیں شرار سینے میں

میری دلی دعا ہے کہ االلہ تعالی ان کے زورِ قلم میں مزید رعنائی اور روانی عطا فرمائے آمین

بساطِ زیست کا شاہین

شاہ روم خان ولی۔۔۔مردان

بساطِ زیست جناب ارشد محمود ارشد کا چوتھا شعری مجموعہ ہے 160 صفحات پر مشتمل یہ کتاب، حرف اکادمی نے دیدہ زیب سرورق کے ساتھ شائع کی ہے۔ جس میں موجود شاعری آنکھوں کے دوش پر سوار ہو کر دل و دماغ تک رسائی حاصل کر رہی ہے۔ اس کتاب کا نام ہی اس کے اندر موجود شاعری کا ترجمان اور عکاس ہے۔

بساطِ زیست پہ اُس نے مجھے یوں رکھا ہے
کہیں ہوں میں جو پیادہ تو شہسوار بھی ہوں

جناب ارشد محمود ارشد نے اپنی شاعری میں کلاسیکی روایت کی پاس داری کے ساتھ ساتھ ترقی پسندی اور جدیدیت کے رجحانات و اثرات کو بھی قبول کیا ہے۔ کلاسیکی، ترقی پسندی اور جدیدیت کی حسیں آمیزش سے اُن کی شاعری کا ایک منفرد رنگ و آہنگ وجود میں آیا ہے۔ ان کے ہاں تخلیقی توانائی اور وفور ہے اور فکری تازگی بھی ہے۔ ان کے ہاں جمود و تعطل نہیں، بلکہ ایک تحرک و تموج ہے۔ ان کا زاویۂ نظر بہت وسیع ہے. جناب ارشد کے کلام میں تفکر و تعقل، طنز و مزاح، حسن و عشق کی داستاں، عصری مسائل و موضوعات کے ساتھ ساتھ تصوف و سلوک کے رموز و اسرار کی جلوہ گری بھی ہے۔ اُن کی شاعری میں عمدہ تشبیہات، استعارات اور تلمیحات کا بھی ہنر مندانہ استعمال ہوا ہے۔

زمیں کی کوکھ سے پہلے شجر نکالتا ہے
وہ اُس کے بعد پرندوں کے پَر نکالتا ہے

ارشد محمود کی شاعری کا ایک خوش گوار پہلو یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنی غزلوں اور نظموں میں آسان اور عام فہم الفاظ و تراکیب کا استعمال کیا ہے۔ ان کی بیش تر غزلیں سہلِ ممتنع کے دائرے میں آتی ہیں۔ ان کی شاعری اپنے اسلوب و انداز کی دل کشی و رعنائی، فکری بلندی، فنی پختگی اور خیالات کی ندرت وجدت کی وجہ سے معاصر شعری منظر نامے میں منفرد مقام کی حامل ہے۔ ان کی شاعری میں بھرپور عصری حسیت کا بھی احساس ہوتا ہے۔ انھوں نے نظم و غزل دونوں صنفوں میں طبع آزمائی کی ہے اور دونوں اصناف میں قابل قدر تخلیقات موجود ہیں، لیکن طبعی طور پر ان کا میلان غزلوں کی طرف زیادہ ہے۔ یعنی زلفِ غزل کی اسیری انھیں زیادہ راس آئی ہے۔

شبِ طویل بھی کاٹی ہے خود کلامی سے
کوئی شریک مرے رتجگے میں تھا ہی نہیں

غزل ایک زمانے تک صرف عشق و عاشقی کے بیان تک محدود رہی۔ لیکن بعد میں اس کے موضوعات میں وسعت آتی گئی۔ شاعروں نے اس کی رمزیاتی لفظیات کا سہارے سے غم جاناں سے لے کر غم روزگار تو کیا تصوف اور سیاسی منظر کشی کو بھی شعری سانچے میں ڈھال دیا۔ ارشد محمود ارشد نے بھی اس روایت کو اپنایا۔

مداری بس تماشا کر رہا تھا
مگر بچہ جمورا مر رہا تھا

مرے اندر کا مجنوں مر چکا تھا
اُسے مجھ سے محبت ہو رہی تھی

یہ کوئی اور طلب پانیوں میں لے آئی
مرا خیال کسی جل پری میں تھا ہی نہیں

دل نے برسوں عذاب جھیلے ہیں
ہم نے کی تھی خطائیں لمحوں کی

جناب ارشد نے چھوٹی اور طویل ہر قسم کی بحروں میں طبع آزمائی کی ہے۔ان کی غزلیات کا یہ مجموعہ ان کے احساسات کا اظہار ہے۔انہوں نے زندگی کے جس موڑ پر جیسا محسوس کیا اس کو شعری پیرایہ اظہار میں قاری کے سامنے رکھ دیا ہے۔
بساطِ زیست میں شامل اُن کی دو نظمیں دیکھیے اور اُن کی نظم کا ذائقہ بھی محسوس کیجیے

قیدی

سنو لڑکی

محبت کے سفر میں تو
کوئی منزل نہیں ہوتی
کہ تپتے ریگزاروں میں
ہمیشہ چلنا پڑتا ہے
یہ ایسا کھیل ہے جس میں
کہیں بھی جیت ہوتی ہے
نہ کوئی مات ہوتی ہے
فقط جو قرب پانے کو
محبت نام دیتے ہیں
بہت نادان ہوتے ہیں
سنو لڑکی
تمھیں تو بنتِ حوّا کی
نظر آتی ہے مجبوری
تمھیں کیسے بتاؤں میں
کہ میں جو ابنِ آدم ہوں
مجھے بھی باندھ رکھا ہے
انہیں رسموں رواجوں نے
کہ جن کی قید میں تم ہو
انہی کا میں بھی قیدی ہوں

ابنِ آدم

کوئی جب پوچھتا ہے یہ
شیعہ ہو تم یا سنی ہو
وہابی ہو کہ دیوبندی
بتاؤ کونسے فرقے سے نسبت ہے
نجانے کیوں مجھے اک پل
سجھائی کچھ نہیں دیتا

میں گہری سوچ میں تب ڈوب جاتا ہوں
مرے اندر سے اک آواز آتی ہے
سنا ہے تم نے بچپن سے
کہ تم تو ابنِ آدم ہو
تو پھر سچ سچ بتاؤ نا
مسلمانوں کے فرقے کیا
کہ ہندو، سکھ، نصاریٰ
پارسی تک بھی
جہاں میں جتنے انساں ہیں
مرے بابا کے بیٹے ہیں
یہ مانا شکل و صورت میں
ذرا سے مختلف ہونگے
رگوں میں دوڑتا ہے جو
لہو تو ایک جیسا ہے
سبھی اولادِ آدم سے
کہ جس میں آدمیت ہو
مری تو اس سے نسبت ہے
اسی سے خون کا رشتہ
یہی سچ ہے
کہ جب میں ابنِ آدم ہوں
مرا مذہب وہی ہے جو
مرے بابا کا مذہب ہے

امید کی جاتی ہے کہ ان کی بساطِ زیست کو ادبی حلقوں میں پذیرائی ملے گی۔

بساطِ زیست کا قصرِ ذات

صائمہ نورین بخاری۔۔ملتان

بساطِ زیست ارشد محمود ارشد کا چوتھا مجموعۂ کلام ہے۔ تخلیقی اور شعری حسن کی حامل غزلیات اور پرتاثیر نظموں کی لفظیات کی بناء پر انہیں دبستانِ سرگودھا میں ایک منفرد مقام مل چکا ہے ناقدینِ فن کی پزیرائی انہیں تسلسل سے اپنے احساسات و جذبات کو بیان کرنے کا حوصلہ عطا کر رہی ہے۔زمین کے سفر میں اگر کوئی شے آسانی ہے تو وہ محبت ہے۔اور ارشد محمود ارشد نے بساطِ دل بھی محبت کی زمین پر بچھائی ہے۔ہر شعر میں ایجاز واختصار کو نمایاں کر کے ایک سچے تخلیق کار کی طرح لفظوں کو صدا دی ہے۔ذات کی نفی کرتے ہوئے شبِ غم میں امید کے دیے جلائے ہیں۔ذاتی احساسات اور تجربات اور مشاہدے کے ہنر کو کمال بخشتے ہوئے بساطِ زیست پہ شعری حسن کے سہرے سجائے ہیں۔وہ ان شعری محاسن سے بھی واقف ہیں جس سے غزل کا روپ سنورتا ہے۔وہ ان جذبات کی حرمت اور منزلت سے بھی بہرہ ور ہیں جس سے نظموں کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔

ارشد محمود ارشد نے چہروں کی دنیا میں پزیرائی کی محفل سجائی ہے۔اور ملک کے کونے کونے سے شعراء کی پزیرائی اور حوصلہ افزائی کا سلسلہ جاری ہے۔وہ تخلیقی سچائی اور اس کی پزیرائی کی خوبصورت کیفیت کو اولین سرمایہ قرار دیتے ہوئے فکر انگیز علامتوں میں اپنی زیست کی شعری خوش رنگی بڑھا رہے ہیں۔اور ان فکر انگیز علامتوں میں ژولید گی نہیں ہے تصنع اور کوئی شعوری الجھن بھی نمایاں نہیں۔اپنے تاثر اور اپنے اعتقاد پر اطمینان کا وقار کچھ اس طرح نمایاں ہے۔

ایسے بھی آزار اٹھانا ٹھیک نہیں
احسانوں کا بار اٹھانا ٹھیک نہیں
بوڑھے پیڑ کی چھاؤں کیسے بانٹو گے
آنگن میں دیوار اٹھانا ٹھیک نہیں

ہجر و وصال کے حسین موسموں، جگنو بن کر آنکھ میں اترنے والے خوابوں اور شبِ غم کے اندھیروں سے نکل کر اس شعری مجموعے میں ارشد محمود ارشد سماجی مسائل کو بڑی حساسیت سے بیان کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔زیست کا شعور اور فلسفیانہ شعور لہجے اور فکر کو موئثر بنا رہا ہے۔۔۔سماجی مسائل مضامینِ غزل میں اس طرح باندھے ہیں کہ غزل کا سوز اور اسلوبِ بیان بھی برقرار رہا ہے۔۔۔

مداری بس تماشا کر رہا تھا
مگر بچہ جمورا مر رہا تھا

وہ جو فٹ پاتھ پر اوندھا پڑا ہے
کبھی اس شخص کا بھی گھر رہا تھا
اک بھیڑیا تھا دوستی کی کھال میں چھپا
اس نے مرے وجود کو کھایا تھا اور بس
زندگی آپ سکھاتی ہے قرینے سارے
زخم ملتے ہیں تو جینے کا ہنر آتا ہے
پھر اس کے بعد ہی دیتا ہے کام کی اجرت
ہمارے خون سے پہلے وہ زر نکالتا ہے

ایک عمدہ تخلیق کار پزیرائی پہ یقین رکھتا ہے اس لئے پزیرائی چاہتا بھی ہے اور چند اشعار ہوں یا چند غزلیں وہ ہر مستند شاعر کے قلم سے ضرور سرزد ہوتی ہیں جن کو پڑھ کر بے ساختہ داد دینے کو دل چاہتا ہے درد سوز و گداز اور حسن و جمال سے آراستہ پیراستہ ان اشعار سے قاری کو باخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ارشد محمود ارشد طبعاً غزل کے شاعر ہیں۔

چشمِ نمناک میں اگی بارش
پھر بڑی دیر تک ہوئی بارش
دل سمندر سے بن گیا صحرا
تو نے بخشی نہ پیار کی بارش
کشتِ دل پہ تمہاری یادوں کی
روز ہوتی ہے ریشمی بارش
دلِ مضطر کے سب کھلونے ہیں
تتلیاں پھول جل پری بارش
شام ڈھلنے پہ آ گئی ارشد
اور اب تک نہیں تھمی بارش

وقت کی آواز میں سکوتِ جاوداں ہر لمحۂ گذشتہ کا احساس دلاتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور شاعری کے فنِ لطیف کو ذہنی سفر توانا رکھتا ہے ایک شاعر جو خود پسند نہ ہو وہ اپنی ذات کا ادراک بخوبی رکھتا ہے اور فلسفۂ شاعری کو بس یہی ادراک چاہیے۔۔۔اس عہد پارسائی میں شرمساری کا احساس کسی کسی کو ہے

۔

یہ مرا دین یہ مذہب غرور ہے ارشد
عمل یہ دیکھ کے اپنے میں شرمسار بھی ہوں
لبادہ اوڑھ کے رکھتا ہوں میں روایت کا
خیالِ دشت کا اِک شتر بے مہار بھی ہوں

بساطِ زیست و فلسفۂ زیست کو سمجھنے والے جانتے ہیں کہ ارسطو کے نظریہ کتھارسس نے کئی تنقیدی زاویوں کو جنم دیا اور جدید نفسیات میں کتھارسس نے ارتفاع کی شکل اپنائی عصرِ حاضر میں ارتفاع کا عمل شاعری کے جذباتی اثر میں شامل ہوتا گیا اور شاعروں نے ایمان عقائد نسل رنگ لسانیات کی بنیاد پر ہونے والے ہنگاموں انتشار کو صدمے کی طرح محسوس کیا اور جذبات کا اظہار کیا باہمی نفرتوں اور خیالی جنتوں کو پروان چڑھانے والوں کے لیے ارشد محمود ارشد کہتے ہیں اور کیا خوب کہتے ہیں۔

وظیفہ تجھ کو بتاتا ہوں ایک چاہت کا
جو قصرِ ذات سے نفرت کا شر نکالتا ہے

نجانے کونسی جنت کی جستجو ہے تجھے
کہ جس کے واسطے جینا مرا حرام ہوا

نظموں میں بھی ارشد محمود ارشد کا طرزِ بیاں صاف اور فکر بلند ہے۔
ارشد محمود ارشد کی "ابن آدم" نظم بلا شبہ آج کے دور کے شر انگیز جذبات کے سامنے ایک ڈھال ہے اس نمائندۂ اعلیٰ جذبات نظم کے لیے خصوصی داد و تحسین۔۔۔۔ فلسفیانہ فکر اور عصرِ حاضر کے دکھ قصرِ ذات میں رہنے کا فن اور عرفانِ ذات کا حصول محبت کا عکس اور اس کی حقیقت تک رسائی کی جستجو کے حاصل اس شعری مجموعے کو پڑھ کر بے ساختہ داد و تحسین کے ساتھ دعا کا احساس بھی جاں گزیں ٹھہرتا ہے میری دعا ہے ارشد محمود ارشد اُن صاحبِ کمال شعراء کی صفِ اولین میں شامل ہو جن کے ہنر اور فن کی پزیرائی وسیع پیمانے پر کی جاتی ہے۔۔۔ نہ صرف حال بلکہ مستقبل میں بھی ان کی پزیرائی اور طرزِ فکر کو باذوق لوگ اپنا اثاثہ سمجھتے ہیں۔

ارشد محمود ارشد کی شعری کائنات

ڈاکٹر شفیق آصف۔۔ سرگودھا

جواں فکر شاعر ارشد محمود ارشد سے میرا تعلق کئی برسوں پر محیط ہے یہ ۲۰۰۵ء کی بات ہے جب میں ملتان سے شاہینوں کے شہر سرگودھا میں اقامت گزین ہوا تو ایک خوبرو اور خوش گفتار نوجوان سے بزم فکر و خیال کی ادبی محفل میں ملاقات ہوئی۔پتہ نہیں ارشد میں وہ کون سی بات تھی کہ وہ مجھے اپنا اپنا سا لگا۔پھر مزید ملاقاتوں کا سلسلہ دراز ہوا تو اس کی شخصیت کے اور بہت سے خوبصورت پہلو بھی سامنے آئے، یہ بات طے ہے کہ ارشد محمود ارشد ایک جینوئن شاعر اور محبت کرنے والا انسان ہے۔ میرے نزدیک انسانی محبت کا پہلو اس کا سب سے نمایاں وصف ہے کیونکہ محبت اور اخلاص کی ہر زمانے میں ضرورت رہی ہے۔ محبتوں کے چراغوں سے ہی نفرتوں کے اندھیروں کو مٹایا جا سکتا ہے۔ارشد محمود ارشد کی شاعری کا بنیادی وصف محبت اور سماجی شعور ہے وہ اپنے شعری منشور کا اعلامیہ اس طرح تحریر کرتا ہے۔

چراغوں کو جلانے کی لگن میں
ہواؤں سے عداوت بڑھ گئی ہے
مجھے اک جل پری نے چھو لیا تھا
مری سانسوں کی حدت بڑھ گئی ہے
ہر اک منظر میں تجھ کو کھوجتا ہوں
بچھڑنے سے محبت بڑھ گئی ہے

ارشد محمود ارشد کا اولین شعری مجموعہ ”عجب سی بے قراری ہے“ 2007ء میں ادب رنگ پبلی کیشنز ملتان کے زیر اہتمام ملتان سے شائع ہوا۔ جبکہ ارشد کا دوسرا مجموعہ کلام ”کبھی میں یاد آؤں تو“ 2009ء میں منظر عام پر آیا جبکہ 2014ء میں تیسرا شعری مجموعہ ”شام کی دہلیز پر“ اشاعت پذیر ہوا۔ ان تخلیقی شعری مجموعوں کے علاوہ ارشد محمود ارشد نے چار شعری انتخاب بھی مرتب کیے جن کے بالترتیب نام ”محبت بانٹ لیتے ہیں“، ”نبیؐ کا قصیدہ“، ”تمہاری یاد کا موسم“، ”کوئی تعبیر دو مجھ کو“ ہیں۔ارشد محمود ارشد کا نیا شعری مجموعہ ”بساطِ زیست“ ہے۔ ارشد محمود ارشد کی شاعری کی تفہیم کے لیے ان کے شعری سفر کو بتدریج دیکھنا پڑے گا۔ میں نے ارشد کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ شاعری کو تفصیل سے پڑھا ہے، بے شمار ملاقاتیں بھی ہوئی ہیں۔اس کا کلام بھی محافل میں سننے کا بارہا موقع ملا۔تاہم جو بات سب سے زیادہ مضبوط ہو کر سامنے آئی وہ اس کی انسانوں سے محبت اور سماجی و معاشرتی شعور ہے اور یہ بات بھی مسلمہ ہے کہ سماجی شعور کا سب سے

زیادہ ادراک وہی شخص رکھتا ہے جو اپنے سماج سے محبت کرتا ہے۔ ارشد نے نہ صرف لوگوں سے محبت کی ہے بلکہ سماجی ناہمواریوں اور ناانصافیوں کے خلاف آواز بھی بلند کی ہے۔ ارشد محمود ارشد اپنے پورے یقین کے ساتھ شعر و ادب سے منسلک رہنا چاہتا ہے۔ لہٰذا وہ اپنے وجدان میں ایسے احساسات اور جذبات کو جگہ دیتا ہے جن کا تعلق عصری تناظر اور ہم عصر معاشرے سے ہوتا ہے مثلاً وہ کہتا ہے۔

غم اٹھا کے بھی مسکراتا ہوں
کون سی خاک سے بنا ہوں میں
تو جہاں پھینک کر گیا تھا مجھے
دیکھ اب بھی وہیں پڑا ہوں میں
اپنی میت اٹھائے پھرتا ہوں
ایک مدت سے مر چکا ہوں میں

ارشد محمود ارشد کے مذکورہ بالا اشعار جس Senstivity کا پتہ دیتے ہیں وہ اس کے ایک حساس فنکار ہونے کی دلیل ہے۔ اور یہ بات مسلمہ ہے کہ ایک حساس فن کار ہی اپنے گرد و پیش بسنے والے لوگوں سے محبت کر سکتا ہے وہ محبت محض رومانوی جذبات پر مبنی نہیں ہو گی بلکہ اس میں انسانی اقدار کی پاسداری کا آدرش بھی موجود ہو گا۔

زندگی آپ سکھاتی ہے قرینے سارے
زخم ملتے ہیں تو جینے کا ہنر آتا ہے

اگر تو قتل میں شامل نہیں تھا
تو چھینٹے کس لیے ہیں آستیں پر
زمانہ خوف کھاتا کس لیے ہے
فقط محراب ہے میری جبیں پر

ارشد محمود ارشد کی شاعری متنوع افکار کی حامل ہے۔ وہ معروف ادبی مراکز سے دور رہ کر بھی اپنی شعری شناخت کو اپنا حوالہ بنانا چاہتا ہے ہرچند کہ سرگودھا ایک معروف دبستان ہے تاہم یہاں وہ ابلاغی

سہولتیں میسر نہیں ہیں جن کا سہارا لے کر بہت سے بالشتیے قدآور بن چکے ہیں تاہم وہ یہ نہیں جانتے کہ میڈیا کی چمک دمک عارضی ہوتی ہے، کسی فنکار کی بقاء کا انحصار اس کی تخلیقات کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ارشد محمود ارشد بھی اس جتن میں ہے کہ اس کے لفظ معتبر ہو جائیں،اس مقصد کے حصول کے لیے وہ پوری دیانت داری سے اپنا شعری سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔ارشد کا تازہ مجموعہ کلام ''بساطِ زیست'' اس کا چوتھا پڑاؤ ہے، جسے پڑھ کر یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ وہ اپنی منزل کے قریب تر ہوتا جارہا ہے۔ معاصر شعری ادب میں ارشد محمود ارشد ان نوجوانوں کی نمائندگی کرتا ہے جو اپنی صلاحیتوں پر اعتماد رکھتے ہیں۔ان کا یہ اعتماد شعری ایقان کی صورت میں ان کے اشعار سے مترشح ہو رہا ہے۔

میں اپنے آپ سے کر سکتا ہوں دغا بازی
اور ایک وصف ہے مجھ میں وفا شعار بھی ہوں

خواہشیں شعور مچاتی ہیں مرے دل میں کئی
ایک بس تیری طلب سب سے جدا گونجتی ہے

شب کے پہلو میں جب تو سو جائے
ایک دنیا ہے جاگتی سورج

ذرا سی دور لٹیروں کی ایک بستی ہے
گزر چکا ہوں میں اس راستے سے پہلے بھی

ارشد محمود ارشد کی شاعری میں داخلیت او رخارجیت کا حسین امتزاج ایک ساتھ نظر آتا ہے وہ معاشرتی تضادات کے ساتھ ساتھ داخلی تصادم کا بیان کرنے میں بھی مہارت رکھتا ہے۔
کیا عجب کہ ارشد محمود ارشد کی شعری اور فنی ریاضت اس کے خوابوں کو جلد تجسیم کردے اور وہ ایسا منظر نامہ دیکھنے میں کامیاب ہو جائے جس کے لیے وہ اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔میں ارشد محمود ارشد کے نئے مجموعہ کلام'' بساطِ زیست'' کا کھلے بازوؤں سے استقبال کرتا ہوں۔
اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

درختوں اور پرندوں سے ہمکلام شاعر

قمر رضا شہزاد۔۔ ملتان

ادبی دنیا میں ہوش سنبھالنے کے بعد جو پہلی آواز میرے کان میں اتری وہ دبستان لاہور اور دبستان سرگودھا کے ناموں کی تھی۔اس وقت تو خیر میں نہیں سمجھ سکا کہ آخر ان دونوں شہروں کو دبستان کیوں کہا گیا مگر کچھ عرصہ گزرنے کے بعد پھر کھلا کہ اس وقت ادبی منظر نامے پر دو بڑے ادیب اور شاعر اپنے اپنے ارادت مندوں کے ساتھ مصروف عمل ہیں۔ان میں ایک نام جناب احمد ندیم قاسمی اور دوسرا نام ڈاکٹر وزیر آغا کا تھا۔ کمال کی بات یہ ہے کہ ان دونوں بڑوں کا تعلق سرگودھا کی سرزمین سے تھا۔جناب احمد ندیم قاسمی بعد ازاں ہجرت کر کے لاہور تشریف لے گئے جب کہ وزیر آغا سرگودھا میں ہی قیام پذیر رہے۔ان دونوں کی ادبی چپقلش نے دو ادبی گروہوں کو جنم دیا۔ قطع نظر اس کے کہ ان دونوں ادبی گروہوں کی مخاصمت ادب کے لیے کتنی سود مند یا نقصان دہ ثابت ہوئی مگر اس کے نتیجے میں دبستان لاہور اور دبستان سرگودھا کے نام سے وہ مکتبہ فکر پروان چڑھے جنھوں نے ایک عرصہ تک ادبی منظر نامے پر حکمرانی کی۔ ملک اور بیرون ملک متحرک ادیبوں کی اکثریت کسی ایک دھڑے کے ساتھ منسلک ہونے کو اپنے لیے اعزاز سمجھتی تھی۔ اگرچہ دونوں بزرگان ادب کے رخصت ہونے کے بعد یہ گروہ ٹوٹ پھوٹ گئے لیکن اس کے نتیجے میں جو ادبی تحرک پیدا ہوا اس کے اثرات آج بھی محسوس کیے جا سکتے ہیں۔خاص طور پر بڑے ادبی مراکز سے الگ تھلگ سرگودھا جیسا شہر اپنی علیحدہ شناخت کے ساتھ نمایاں ہوا۔ آج بھی سرگودھا کی ادبی سرگرمیاں اس کی گواہی دے رہی ہیں کہ وہاں ایک تسلسل کے ساتھ سنجیدہ تخلیقی کام ہو رہا ہے۔

نثر اور شاعری ہر دو میدان میں یہاں کے ادیب اور شاعر بھرپور طریقے سے سرگرم عمل ہیں۔انہی شاعروں میں ایک معتبر نام ارشد محمود ارشد کا ہے جو ۲۰۰۰ء کی دھائی میں ادبی افق پر طلوع ہونے والے ان ستاروں سے تعلق رکھتا ہے جنھوں نے اپنی شاعری کی چمک دمک سے اہل علم ادب کو اپنی طرف متوجہ کیا اور میں سمجھتا ہوں ادبی دنیا میں صرف شعر کی بنیاد پر ہر دوسروں کی توجہ حاصل کر لینا وہ کامیابی ہے جو شعراء کے ہجوم میں کم کم خوش نصیبوں کے حصے میں آتی ہے اور وہ کم کم خوش نصیب وہی ہوتے ہیں جن کا مرکز و محور ان کا تخلیقی کام ہوتا ہے۔ وہ صلے اور ستائش کی تمنا کیے بغیر اس میں لگن کے ساتھ جُتے رہتے ہیں۔انہیں نہ تو کسی کے مشہور ہونے سے کوئی غرض ہوتی ہے اور نہ ہی شاعری ان کے لیے دنیا کمانے کا ذریعہ وہ تو صرف شعر کہتے ہیں مست رہتے ہیں۔

میں اپنے بعد میں آنے والے اچھے شعراء کی شاعری سے کبھی غافل نہیں رہا۔ارشد محمود ارشد بھی دیگر عمدہ شاعروں کی طرح مسلسل مرے مطالعے میں رہا۔ادبی جرائد اور سوشل میڈیا جہاں بھی مجھے ان کی غزل پڑھنے کو ملی مرے لیے سرشاری کا باعث بنی یقیناً اُس کا کوئی دعویٰ نہیں کہ

وہ ایک عظیم شاعر ہے۔ لیکن ایسا بھی ہر گز نہیں ہے کہ اس کی شاعری کو نظر انداز کیا جا سکے۔ جب ہم خود ساختہ عظمت کے ڈر سے نکل کر شاعری کی تفہیم کا فریضہ انجام دیتے ہیں تو ایک خوشگوار حیرت ہماری رگ و پے میں دوڑ جاتی ہے۔ وقتاً فوقتاً آنے والے غزل کے عمدہ شاعروں نے غزل کو اتنا امیر کیا ہے کہ غزل کی موت کا اعلان کرنے والے خود اپنی موت مر گئے ہیں۔

ارشد محمود ارشد نے اپنی غزل کا خمیر عہد حاضر کی صورت حال اور اپنے اندرون کی دنیا سے جنم لینے والی ایسی کیفیات سے اٹھایا ہے جو ہر پڑھنے والے کو اپنی محسوس ہوتی ہیں۔ عمدہ شاعری کا کمال بھی یہی ہے کہ وہ شاعر اور قاری کے مابین فاصلوں کو ختم کر دیتی ہے اور جب یہ فاصلے ختم ہو جاتے ہیں تو پھر شعر کا قاری شاعر کی دنیا کا حصہ بن جاتا ہے۔ مرے خیال میں یہی وہ بنیادی بات ہے جو کسی شاعر کے کلام کو قبول عام کا درجہ دیتی ہے اور یہ سارے کا سارا عمل شعوری سطح پر شاید اس لیے بھی ممکن نہیں کہ جینوئن شاعر سب سے پہلے اپنے اور اپنی ترجیحات کا تابع ہوتا ہے۔ وہ صرف اور صرف انہی معاملات یا واردات کو اپنی شاعری میں اتارتا ہے جو وہ محسوس کرتا ہے اور جو شاعر ایسا کرنے پر قادر نہیں وہ محض مصرعے تو وزن میں کر سکتا ہے لیکن ان میں وہ شعری روح نہیں پھونک سکتا جو کسی شعر کو زندگی بخش سکتی ہو۔ یہی وجہ ہے ہمارے ہاں مردہ شاعری کے ڈھیر لگے ہوتے ہیں اور جنہیں وقت وقتاً فوقتاً سپرد خاک کرتا رہتا ہے۔ ارشد محمود ارشد کے کلام میں زندگی اس لیے سانس لیتی ہے کہ اس نے اپنے سچ کو اس میں سمویا ہے۔ اس کے اپنے دکھ سکھ، محبتیں نفرتیں اور اپنا نظریہ زندگی اس کی شاعری میں جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ اس نے اپنی شاعری کا خام مواد اسی مٹی سے اٹھایا ہوا ہے جہاں اس کے پاؤں جمے ہوئے ہیں اور یہ مٹی اس کے اپنے شہر سرگودھا کے مضافات کی ہے جہاں آج بھی درختوں اور پرندوں کی حکومت ہے۔ اور یہ سب کچھ اس کی شاعری میں اس طرح نمایاں ہوا ہے۔

گھنے درخت کے سائے میں جب قیام ہوا
میں پہلی بار پرندوں سے ہم کلام ہوا

اس لیے سر پہ اٹھایا ہے یہ غم کا سورج
دھوپ پڑتی ہے تو پیڑوں پہ ثمر آتا ہے

کٹ کے جب بھی درخت گرتا ہے
پھڑ پھڑاتے ہیں تب پرندے بھی

پھول پرندوں اور درختوں سے محبت کرنے والا شخص ایسے گداز دل کا مالک ہوتا ہے۔ جسے دنیا بھر کے تمام انسانوں کے دکھ اپنے دکھ لگتے ہیں۔ اسی احساس کی شدت اور حساسیت نے ارشد محمود ارشد کے کلام کو اس کی ذات سے نکال کر کائنات تک پھیلا دیا ہے۔

ارشد محمود ارشد کے شعری سسٹم میں نمایاں اور اہم بات اس کی جدید شعری حسیات سے آگاہی اور تازگی کا عنصر ہے اور یہی وہ عنصر ہے جو شاعری کے ظاہری لباس کو دیدہ زیب اور دلکش بناتا ہے اعلیٰ سے اعلیٰ مضمون اگر بھونڈے طریقے سے بیان کیا گیا ہو تو وہ ہرگز اپنا تاثر نہیں چھوڑتا جبکہ بعض اوقات معمولی سی بات نئے رنگ ڈھنگ اور سلیقے سے بیان کی جائے تو وہ ایک ایسا لطف سخن پیدا کرتی ہے جو پڑھنے والے کے وجود میں اتر کر اسے دائمی سرشاری عطا کرتی ہے۔ ارشد محمود ارشد نے بہت سے مقامات پر تازگی کے اس ہتھیار کو نہایت چابکدستی سے استعمال کیا ہے جس کی بدولت اس کا کلام بابرکت تاثیر سے آشنا ہوا ہے۔ چند شعر ملاحظہ کریں:

بدن کی بھربھری مٹی کو دھول کر بیٹھا
کسی کے واسطے میں راستہ بناتا ہوا

تو جہاں پھینک کر گیا تھا مجھے
دیکھ اب بھی وہیں پڑا ہوں میں

یہ کوئی اور طلب پانیوں میں لے آئی
مرا خیال کسی جل پری میں تھا ہی نہیں

کہانی انتہا تک آگئی ہے
کہیں آیا نہیں کردار میرا

آؤ دو چار قدم چل کے ذرا دیکھتے ہیں
پھول بہتے ہوئے پانی میں کہاں سے آیا

ارشد محمود ارشد کی شاعری کے ساتھ وابستگی والہانہ ہے اس کا شمار ان گنے چنے شعراء میں ہے جو اپنا لمحہ لمحہ شاعری میں گزارتے ہیں اور فی زمانہ ایسے شاعر کا دم شاید اس لیے بھی غنیمت ہے کہ اس بے مستی کے عہد میں کوئی تو ہے جو لوگوں کے دکھ درد نہ صرف محسوس کرتا ہے بلکہ انہیں شعر کی زبان بھی دیتا ہے۔

مری دعا ہے کہ خداوند کریم ارشد محمود ارشد کی شعری توفیقات میں مزید اضافہ کرے اور اس خوبصورت مجموعے کے بعد بھی اس کا شعری سفر بلندی کی طرف جاری رہے۔ آمین

ادھورے پن کا ادراک

سیما غزل۔۔کراچی

بعض روحیں کسی چیز یا بات کا کھوج تلاش اور جستجو لے کر پیدا ہوتی ہیں۔ شاید انہیں ہمیشہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ کھویا ہوا ہے جو انہیں ہمیشہ ادھورا رکھے گا۔۔۔اور اپنی تکمیل کا شدید اضطراب انہیں اور ان کی سوچ کو کبھی چین نہیں لینے دیتا۔۔۔سکون سے بیٹھنے نہیں دیتا۔۔

ایسے لوگ کائنات میں آنکھیں کھولتے ہی اپنی کھوج کی ابتدا کر دیتے ہیں۔آپ نے یقیناً ان بچوں کو دیکھا ہوگا جو کھیلنے کی بجائے کسی کونے میں بیٹھ کر ریت پر لکیریں کھینچتے رہتے ہیں۔۔۔ یا خلاؤں میں نگاہیں جمائے اپنی ہی ذات کے سفر پر نکل جاتے ہیں۔۔۔ایک ایسے راستے پر جس کی اپنی پہچان بھی نہیں ہوتی۔۔۔ وہ نہیں جانتے کہ وہ کہاں ہیں۔۔۔کیوں ہیں۔۔۔ اور کیا کر رہے ہیں ۔۔۔لیکن وہ اپنے ہی اندر بیٹھے خود کو غور سے دیکھ رہے ہوتے ہیں۔۔۔

آپ نے وہ بچے بھی ضرور دیکھے ہوں گے جو کھلے آسمان تلے لیٹ کر بادلوں کی تصویریں ترتیب دینے لگتے ہیں "یہ لڑکی ہے" بال کھولے بیٹھی ہے' مجھے دیکھ رہی ہے" "وہ میں ہوں۔۔۔اُڑ رہا ہوں" "وہ کوئی بابا ہے سب کے درمیان میں کھڑا ہے" وہ کوئی ہے جو دیوار بنا رہا ہے" "اور۔۔۔وہ پرندہ ہے' کہیں جیسے بھیگا ہوا بیٹھا ہے"ایسی ہی بہت سی کہانیاں بناتے بناتے وہ بے خبر سو جاتا ہے مگر اگلی صبح اسی بے چینی اور اضطراب کے ساتھ اٹھ بیٹھتا ہے۔پھر وہی ریت پر لکیریں ' بادلوں کی تصویریں ' بھیگا ہوا پرندہ۔۔۔ذات کا خوف زدہ کر دینے والا سفر۔۔۔وہ چاند کو دیر تک دیکھتا اور اس کی روشنی کو اپنی آنکھوں میں بھرنا چاہتا ہے۔وہ تیز بارش میں بھیگتا اور پھسل کر گر جاتا ہے' پھر بھیگتا ہے' پھر گرتا ہے۔۔منع کرنے کے باوجود بھی باز نہیں آتا' وہ بچہ ادھورے مناظر میں پلتا ہے' ادھورے پن کو سینے سے لگائے آگے بڑھتا ہے' پھر ایک وقت آتا ہے جب اسے "ادھورے پن" کا ادراک ہو جاتا ہے۔۔۔مگر سب دکھائی نہیں دیتا۔۔۔ سجھائی نہیں دیتا۔۔۔ تب کبھی وہ کسی کینوس پر لکیریں کھینچ کر' ان کے رنگوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے پھیلا کر اپنے اندر کی تشنگی کو لکیروں اور رنگوں میں تلاش کرتا ہے یا پھر اس تشنگی کو ان کے سپرد کر دیتا ہے ڈ کبھی وہ شعر کہہ کر اپنی ذات کے پرت لوگوں کے سامنے رکھتا چلا جاتا ہے' مگر اصل میں وہ یہ سارے پرت اپنے ہی سامنے رکھ کر وہ حصہ تلاشنے کی کوشش میں ہوتا ہے جو کہیں کھو گیا ہے۔کچھ کھو جانا۔۔۔صرف اس کا خیال یا واہمہ نہیں ہوتا۔۔۔اس کی جستجو یہ ثابت کرتی ہے کہ کہیں کچھ ہے جو ملا تو وہ مکمل ہو جائے گا۔۔۔تو نثر لکھنا' لکھتے چلے جانا۔۔۔شاعری کرنا۔۔۔کرتے چلے جانا' پینٹنگ کرنا اور کرتے چلے جانا۔۔۔یہ سب وہی ہیں جو خود کو کھوجنے نکلے ہیں۔۔کون جانے کوئی مکمل ہوتا بھی ہے کہ نہیں

۔۔۔لیکن یہی تو زندگی ہے۔۔۔پیدا ہونا' کھانا' پینا اور مر جانا۔۔۔انسان کی زندگی ہو ہی نہیں سکتی تو۔۔۔ارشد محمود ارشد۔۔۔اسی قافلے کا فرد ہے۔۔۔خدا کہتا ہے خود کو کھوجنے کی کوشش کرو ۔۔۔مانگنے کا سلیقہ پیدا کرو' میں تمہیں سب کچھ دوں گا' سو۔۔۔یہی اُمید ہے جو کسی باریک روشن لکیر کی طرح اس اندھیری دنیا میں کچھ لوگوں کو راستہ دکھاتی ہے۔اور یہ لوگ۔۔۔اسی روشن لکیر کو تھامے آگے۔۔۔اور آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔اسی روشن' باریک لکیر کا ایک سرا ارشد محمود ارشدؔ کے ہاتھوں میں بھی ہے۔لیجیے میں ثابت کرتی ہوں کہ میں نے ٹھیک کہا۔

جدھر نگاہ کروں ریت ہے یا گرد و غبار
کہ سنگِ میل بھی صحرا کے راستوں میں نہیں

بس۔۔۔مجھے ارشد محمود ارشدؔ سے ایک شکایت ہے کہ ان کی تحریروں میں کہیں بے ساختہ اور بہت بکھری ہوئی مایوسی دکھائی دیتی ہے۔اتنی بکھری ہوئی کہ سمیٹنے میں ارشد کو بہت مشکل ہو گی۔۔۔ جیسے۔۔۔

بس اب تو شوق ہی اڑنے کا رہ گیا ارشدؔ
ذرا سی جان بھی ٹوٹے ہوئے پروں میں نہیں

یا جیسے۔۔۔

رفتہ رفتہ سب رگوں میں سنسناہٹ آ گئی
نفرتوں کے زہر کا ایسا اثر ہونے لگا

البتہ۔۔۔مندرجہ ذیل شعر پڑھ کر اچھا لگا اور یوں محسوس ہوا جیسے ارشد کے اندر وہ کھوجی بچہ آج بھی پوری آب و تاب سے موجود ہے جو اسے چین نہیں لینے دے گا اور۔۔۔وہ شعر ہے۔

اک دن اسی مقام پر آئیں گے وہ ضرور
ارشدؔ نے جانے والوں کو روکا نہیں کبھی

یہ یقین یہ بھرپور اُمید اور یہ بے نیازی اور خود اعتمادی تکمیل کی طرف پہلا قدم ہے اور ایسی ہی بہت سی اُمیدیں ارشد محمود ارشدؔ کی شاعری میں موجود ہیں۔مجھے اطمینان ہوا کہ میں کسی بے سمت' اُلجھے ہوئے اور کنفیوزڈ شخص کو نہیں پڑھ رہی' بلکہ ایک ایسے شخص کو پڑھ رہی ہوں جو نہ صرف پُر امید ہے بلکہ اپنے قاری کو اُمید کی ''چنگاریاں'' ہی سہی۔۔۔مگر بانٹ تو رہا ہے۔

کتاب زیست بساط زیست

شاہدہ تبسم۔۔راولپنڈی

آجکل ارشد محمود ارشد کی نئی شعری کاوش،،بساطِ زیست،،زیر مطالعہ ہے ارشد کو میں زیادہ نہیں جانتی فیس بک پر گاہے گاہے انہیں پڑھنے کا موقع ملا۔ایک مشاعرے میں انہیں دیکھا بھی۔ارشد نوجوان مگر کہنہ مشق شاعر ہیں۔ایک الگ آہنگ رکھتے ہیں۔عصری شعور اور جدید و قدیم کے تزکرے اپنی جگہ اہم لیکن مجھے ارشد کی جس خصوصیت نے زیادہ متاثر کیا وہ ان کی فطرت سے دوستی ہے زیادہ کیا کہوں۔آپ نمونہ دیکھیے

روز ٹوٹی ہے آس کی ڈوری
روز پوچھا ترا پرندوں سے
قید سانسیں نچوڑ لیتی ہے
جال کہنے لگا پرندوں سے
غم کے پنچھی ہیں دل کی شاخوں پر
خوب پائی وفا پرندوں سے
تم جو آنکھیں بدلنے لگتے ہو
خوب سیکھی ادا پرندوں سے
لوٹ آئیں گے دیکھنا ارشد
پیار اتنا کیا پرندوں سے

عصری مسائل بھی فطرت کے استعاروں میں زیادہ کھل کے وضاحت پاتے ہیں۔

کیسے کپاس کے لیے گندم کو چھوڑ دوں
مٹتی نہیں ہے بھوک تو کاتوں میں سوت کیا

محبوب کے ذکر کے دوران میں بھی فطرت نت نئے رنگوں میں استعارہ بنتی ہے۔

زندگی اب تو اماوس کی طرح لگتی ہے
چاند جگنو نہ کوئی تجھ میں ستارہ رکھا

یادِ یار بھی ذکر کائنات بن جاتا ہے۔

ذرا سی دیر میں آنکھیں برسنے والی ہیں
تمہاری یاد کی چمکی ہیں بجلیاں مری جاں
چلو ہم چاند پر چل کر بسائیں بستی کو
بچھے کے راہ میں تاروں کی کہکشاں مری جاں

وہ روائتی علامات پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ آنکھوں دیکھے اپنے دور کے تجربات سے امیجری کشید کرتے ہیں

اب ارشد ضبط کا بندھن ٹوٹنے کا خوف رہتا ہے
مری آنکھوں کا پانی بھی تو خطرے کے نشاں تک ہے

وہ روایت سے قریب تر ہوتے ہوئے بھی دل کی بات کہہ جاتے ہیں۔

تیری یاد کا ساون آیا
میری آنکھ سے برسا بادل

اپنی مٹی سے جڑے استعارے ان کی شاعری کو خالص ہی نہیں بناتے معنی کی گرہیں بھی احسن طریقے سے کھولتے ہیں۔

قصرِ نمود ذات سے باہر نکل کے آ
میں بھی انا کے غار سے نکلا ہوں اب کی بار

ان کے ہاں ایک سچے فنکار کی بے نیازی ہے۔

کس واسطے دنیا مرے کاسے میں گرا دی
درویش ہوں میں اس کے سوا مانگ رہا ہوں

آہنگ کے لئے بھی وہ فطرت کے نت نئے رنگ مستعار لیتے ہیں۔

برف بدن کو چھو آئی
جون کی ٹھنڈی ٹھار ہوا

روز مجھ کو اچھال دیتی ہیں
روز آنکھوں میں ڈوبتا ہوں میں

وہ اس دور کے شاعر ہیں۔ ان کا محبوب بھی چلمنوں کے ساتھ لگ کے نہیں بیٹھتا۔ ان کا محبوب انہی کے ماحول میں بستا ہے

کیمپس کی سیڑھی پہ بیٹھی
کس کا رستہ دیکھ رہی ہو

سچ مچ کوئل جیسا میٹھا لہجہ ہے
کیا تم میری کچھ غزلیں گا سکتی ہو

کتاب کے آخر تک پہنچ کر بھی اختتام کا احساس نہیں ہوتا۔ شاعری ان کے لیے لت ہے، عادت ہے، لازمہ زندگی ہے۔ جس طرح سردی سے بچنے کے لیے آگ تاپتے ہیں، غم غلط کرنے کے لیے سگریٹ سلگاتے ہیں اسی طرح ارشد شاعری تلخی روزگار کو گوارا بنانے کے لئے گھونٹ گھونٹ پیتے ہیں۔ اس دوران وہ کبھی کبھار صحرا سے دور نخلستان کی سیر بھی کراتے ہیں چاہے وہ نخلستان ان کے گاؤں کی کسی جھیل کا کنارہ ہو یا عارض محبوب کا ذکر خیر۔۔ کہ اس ذکر ہی میں سرشاری ہے اس لیے شاعری کی کہانی رکی نہیں بقول ان کے سانسوں کی ہوت تک جاری رہے گی۔

بادہ کشی کی ساری حلاوت تمام شد

ڈاکٹر ارشاد خان۔۔ بھارت

ارشد محمود ارشد اردو ادب کے افق پر نیا نام نہیں۔ جدید غزل کی جب بھی تاریخ لکھی جائے گی وہ ارشد محمود کے منفرد لب ولہجے، جدت طرازی، فکری جہت اور تغزل کی آمیزش سے جو انہوں نے غزل کے گیسو کو سنوارا ہے، ان کے اس کارہائے نمایاں کے بغیر ادھوری رہے گی۔

غزل جو کہ اردو ادب کی مقبول صنف رہی ہے، جو کہ میر و غالب کی ندرتِ خیال اور معنی آفرینی سے گزرتی ہوئی حالی کی بوقلمونی، اقبال کے فلسفہ سے لے کر ترقی پسند تحریک کے سیلاب تیز وتند سے جذبی، فراق، فیض و مجروح اسے نہ صرف صاف بچالائے بلکہ اسے سحر انگیز جدیدیت کے رخ پہ ڈال دیا۔ ساتھ ہی روایت کو برتتے ہوئے نئے مفاہیم تراشے، نئے موضوعات کو سمو کر انقلابی سانچے میں ڈھال دیا۔ ن۔م راشد نے غزل کے ساتھ جو بے اعتنائی برتی ہو وہ اپنی جگہ، کلیم احمد نے اسے نیم وحشی صنف سخن کہا ہو وہ اپنی جگہ لیکن ناصر، قتیل، فراز، شعری، کیف وغیرہم نے اسے جو وقار بخشا، اسے جو قدر و منزلت عطا کی اسی وراثت کے امین، ارشد محمود ارشد ہیں۔ ارشد بنیادی طور پر غزل گو شاعر ہیں۔ ان کے اب تک چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ 1 عجب سی ہے قراری (2007)۔ 2 کبھی میں یاد آؤں (2009)۔ 3 شام کی دہلیز پر (2014)۔ 4 بساط زیست (2017) ۔۔۔ زیر نظر مضمون شعری مجموعہ "بساط زیست" کا اجمالی جائزہ لیے ہوئے ہے۔ بساط زیست میں ارشد کے قلم کی جولانیاں ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ جدید اصطلاحیں، نادر ردیف وقافیے قاری کو اپنے سحر میں گرفتار کر لیتے ہیں کہ:

سانسوں سے لپٹی آخری چاہت تمام شد

ارشد محمود بارگاہِ حسن میں فیصلے کے ملتجی ہیں کہ اتمامِ حجت ہو چکی، انہوں نے ایک نیا خیال پیش کیا ہے کہ:

اس نامراد عشق کی حجت تمام شد

اصولی طور پر فریقین کو سننے کے بعد بھی فیصلے میں تاخیر اور اس میں چھپے کرب کو جھیلتے ہوئے، یاد دہانی "حجت تمام شد" معنی آفرینی پیدا کر دیتی ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ردیف میں ندرت ارشد کا خاصہ ہے۔ ماضی میں پروین شاکر اور حال میں افتخار راغب اس میں کمال رکھتے ہیں۔ ایک غزل میں ارشد نے ردیف "تھا ہی نہیں" کو بڑی خوبی سے برتا ہے:

یہ کوئی اور طلب پانیوں میں لے آئی
مرا خیال کسی جل پری میں تھا ہی نہیں

پانیوں بطور جمع مستعمل کرشن چندر نے نثر میں اور چند ایک نے نظم میں، بارشوں کا موسم بھی برتا گیا پر ارشد کے یہاں پانیوں کے ساتھ جل پری بلیغ استعارہ ہے۔اسی غزل کا ایک شعر:

اسی کا پوچھتا ہوں ہر گزرنے والے سے
تیرا مکان کہ جو اس گلی میں تھا ہی نہیں

یہاں انسان کی بد حواسی جو کہ دیوانگی کی حد تک پہنچ چکی ہے۔اسے اس سراب کی طرف دوڑا رہا ہے جو صحرا میں پیاسے کو دیوانہ وار دوڑاتا ہے۔یہ ٹوٹا بکھرتا انسان، بقول شہریار

اس شہر میں ہر شخص پریشان سا کیوں ہے

اسے کہیں امید کی کرن نظر نہیں آتی۔یہ مادہ پرستی کے دور میں انسانی اقدار کی پائمالی، انسان کی بے وقعتی پر محمول کریں تو بے جا نہ ہو گا۔فیض نے اپنے اس شعر میں جو بات کہی تھی:

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

اسے ہم سیاسی پس منظر میں لیں یا اشارے کنایے میں اظہارِ خیال لیکن دبے الفاظ میں "ذکر نہ تھا" جبکہ ارشد برملا اظہار کر رہے ہیں کہ "تھا ہی نہیں" اسے ہم آزادی اظہارِ رائے پر ایک قدم اور پر محمول کریں گے۔ارشد محمود نے اپنی غزلوں میں محاوروں کا بھی بر محل استعمال کیا ہے۔سخت اور کھردرے محاوروں سے لوہا لیا ہے اور انہیں سیاہ ملائم زلفوں سے باندھ رکھا ہے:

کالی زلف کا لوہا منوا سکتی ہو
میری سوچ کے سورج پر چھا سکتی ہو

ارشد نے یہ نہیں کہا کہ "لمبی ہے غم کی رات مگر رات ہی تو ہے" بلکہ یہ کہ میری سوچ کے سورج پر پہرہ ناممکن ہے، سورج کا استعارہ وسیع مفہوم میں مستعمل ہے۔یہ اندرون دبا جوالا مکھی کسی بھی پل پھٹ سکتا ہے۔اسی اندرون پنپتے باغیانہ تیور کو مجروح نے بڑی وضاحت سے پیش کیا ہے"

ہم تو آواز ہیں دیوار سے چھن جاتے ہیں

اور اسی روپے کو ارشد محمود یوں بیان کرتے ہیں ;

کہ بوڑھے پیڑ کے تیور بدلنے لگتے ہیں
کہیں جو گھاس کا تنکا بھی سر نکالتا ہے

اور اس بوڑھے پیڑ کے خائف ہونے کی وجہ خود ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں جو "صدیوں کے بہیمانہ طلسم" پر محیط ہے;

پھر اس کے بعد ہی دیتا ہے کام کی اجرت
ہمارے خون سے پہلے وہ زر نکالتا ہے

یہ غالباً اقبال کے رجحان ؛

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

کا تتمہ نہیں بلکہ دولت کی غیر مساوی تقسیم ، ظلم و استبداد کے کولھو میں پستی زندہ لاشیں جو جاگیر دارانہ نظام سے سامراجیت اور پھر نام نہاد طرز جمہور کی غیر شفافیت کے خلاف ایک سوچ اذہان میں پنپ رہی ہے۔ارشد کے فن کا ایک کمال ، سادگی اور پرکاری ہے ۔ وہ دقیق اور ثقیل الفاظ سے گریز کرتے ہوئے کام کی بات کہہ جاتے ہیں اور وہ بھی اس دلنشیں انداز میں جو سیدھا دل میں اتر جائے۔ اس پرکاری کے ساتھ کہ شعر میں نہ صرف معنی آفرینی ہو بلکہ گہرائی و گیرائی بھی پیدا ہو۔ وہ صرف قافیہ پیمائی نہیں کرتے بلکہ ہر شعر کو گنجینۂ معنی کا طلسم بنا دیتے ہیں، جیسے ؛

قرطاس پر پڑے ہوئے مردہ حروف ہیں
جن میں رمق نہیں انہیں تحریر مت سمجھ
کچھ سازشیں بھی کام دکھاتی ضرور ہیں
ارشد ہر ایک بات کو تقدیر مت سمجھ

نادر تشبیہات بھی ان کا خاصہ ہے۔

دل مضطر کے سب کھلونے ہیں
تتلیاں ، پھول ، جل پری ، بارش

ایک غزل کے چند اشعار جو ان کے فنکارانہ صلاحیت کے ترجمان ہیں ؛

ابھی کچھ دن مناجاتیں رہیں گی
ابھی سر پر مصیبت ناچتی ہے
سرِ محفل ہے کوئی محوِ رقصاں
پسِ پردہ ضرورت ناچتی ہے

المختصر ارشد محمود کی غزلوں کا مجموعہ بساط زیست رموزِ زیست سے آشنائی اور زندہ بشر کو خود شناسی سکھاتا ہے۔ بے شک اس کی ہر حلقے میں پذیرائی ہونی چاہیے۔

بساطِ زیست کا شاعر

مختار تلہری۔۔ بریلی اتر پردیس انڈیا

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنی اڑان دکھانے کے لئے دوسروں کے پروں کا سہارا لیتے ہیں۔ لمبائی بڑھانے کے لئے دوسروں کے کاندھوں پر کھڑے ہو کر اونچائی کا اظہار کرتے ہیں لیکن کچھ لوگ وہ ہیں جو ذہنی قوتوں کی پرواز سے خود ہی اپنا لوہا منوا لیتے ہیں انہیں میں ایک نام ارشد محمود ارشد کا بھی ہے جنھوں نے اپنی فنکارانہ صلاحیتوں سے خود کا لوہا منوایا ہے۔یوں تو موصوف کے چار مجموعہ ء کلام شائع ہو چکے ہیں جن سے میں محظوظ تو نہ ہو سکا لیکن فی الوقت میرے سامنے پندرہ اغزلیں ہیں جن کو دیکھ کر یقین ہوتا ہے کہ وہ کتابیں بھی پڑھنے سے تعلق رکھتی ہونگی۔۔ چونکہ دھانوں کے گاؤں کا اندازہ پیال سے ہو جاتا ہے۔جناب ارشد محمود ارشد صاحب کی چند غزلیات نے کافی حد تک متاثر کیا ہے موصوف کی شاعری میں الفاظ کی نشست و برخاست۔ مفاہیم واسلوب کی ہم آہنگی لہجے کی شگفتگی۔ ترسیل کی برجستگی المختصر جو محاسن –غزلیات ہونا چاہئے وہ سب موجود ہیں۔مناسب سمجھتا ہوں کہ نمونہ ء کلام پیش کیا جائے اور ویسے بھی صاحب –کلام کا صحیح تعارف اس کا کلام ہی کراتا ہے۔یہاں پر طوالت کو مد نظر رکھتے ہوئے کچھ اشعار قارئین کی خدمت میں پیش کرتا ہوں ملاحظہ فرمائیں

گھنے درخت کے سائے میں جب قیام ہوا
میں پہلی بار پرندوں سے ہمکلام ہوا

بچا کے لایا تھا جنات سے میں شہزادی
اسی کے ساتھ کہانی کا اختتام ہوا

دستِ قضا بڑھا ہے مری سمت الوداع
اے اعتکافِ عشق عبادت تمام شد

ٹوٹی ہے آج سانس کی ڈوری تو یوں ہوا
ان دیکھی منزلوں کی مسافت تمام شد

بجھتے ہوئے چراغ کی صورت ہوا ہوں میں
اک خوبرو وجود کی طاقت تمام شد

ارشد مجھے تو غیب سے آتی ہے اب صدا
ابنِ تراب ! اب تری مہلت تمام شد

یہ کوئی اور طلب پانیوں میں لے آئی
مرا خیال کسی جل پری میں تھا ہی نہیں
میں ایک بزمِ طرب سے نکل کے آیا ہوں
سرورِ ہجر کسی راگنی میں تھا ہی نہیں
بس اک سکوتِ مسلسل تھا چارسو اپنے
کوئی خیال کی بارہ دری میں تھا ہی نہیں

پیچھا کرتے اک آوازے کا
شب نے سینہ چاک کیا دروازے کا
دور افق پر ایسے لالی پھیل گئی
جیسے رخ پہ لیپ کیا ہو غازے کا
آگ سے کھیلنے والے ہاتھوں کو ارشد
سامنا کرنا پڑتا ہے خمیازے کا

محشر میں کام آئیں گے اعمال ہی ترے
نام و نسب کو باعثِ توقیر مت سمجھ
قرطاس پر پڑے ہوئے مردہ حروف ہیں
جس میں رمق نہیں اسے تحریر مت سمجھ

کشتِ دل پر تمہاری یادوں کی
روز ہوتی ہے ریشمی بارش

یہ اور اسی طرح کے اشعار چمکتے ہوئے موتیوں کی طرح جا بجا بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آسمانِ سخن پر ستاروں کی طرح چمکنے والے ناموں میں ایک نام جناب ارشد محمود ارشد کا بھی ہے۔ پروردگارِ عالم سے دست بہ دعا ہوں کہ موصوف نگاہِ حسد سے محفوظ رہیں اور ادبی حلقوں میں خوب خوب پذیرائی ہو۔

بساطِ زیست

ڈاکٹر فرحت عباس۔۔راولپنڈی

دنیائے ادب کی دو ممتاز شخصیات احمد ندیم قاسمی اور ڈاکٹر وزیر آغا کے آبائی ضلع سرگودھا سے تعلق رکھنے والے ارشد محمود ارشد تقریباً اٹھارہ سال قبل ادب کے افق پر نمودار ہوئے اور مسلسل کوششوں اور مشقِ سخن کو جاری رکھتے ہوئے قابلِ ذکر شعراء میں شمار ہونے گئے ہیں۔ایک زمانہ تھا جب دبستان لاہور اور دبستان سرگودھا کا علمی اور ادبی محفلوں میں تذکرہ عام تھا اور ادب کے میدان میں ڈاکٹر وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی ادبی گرو مانے جاتے تھے۔دونوں کا تعلق سرگودھا سے تھا۔احمد ندیم قاسمی نے لاہور کو اپنا مسکن بنالیا اور ڈاکٹر وزیر آغا سرگودھا میں ہی مقیم رہے۔ایک زمانہ تھا جب شاعروں اور ادیبوں کے دو گروپ تھے،ایک گروپ کے قائد احمد ندیم قاسمی اور دوسرے گروپ کے ڈاکٹر وزیر آغا تھے۔پنجاب سے تعلق رکھنے والے اہلِ قلم ان دونوں میں سے کسی ایک سے وابستہ تھے اور اس وابستگی کو اعزاز خیال کرتے تھے۔ان جید اہلِ قلم بزرگوں کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد ان کے ادبی گروہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئے۔ان دونوں بڑے اہلِ قلم کے گروپوں کے وجود میں آنے سے ادب کے فروغ اور اہلِ قلم کی حوصلہ افزائی و پذیرائی کے عمل کو واضح طور پر تقویت ملی۔محنت اور مقابلے کا رجحان عام ہوا ماسوئے اس کے کہ ان دونوں گروپوں سے تعلق رکھنے والے اہلِ قلم ایک دوسرے کے گروپوں کی ادبی تقریبات میں شرکت سے کچھ گریز کرتے ہیں۔

بہرکیف سرگودھا کے شاہینوں کی طرح سرگودھا کے اہلِ قلم اور اہلِ فکر ونظر کا مقام نمایاں ہے۔سرگودھا میں نثری اور شعری ادب دونوں یکساں طور پر فروغ پا رہے ہیں۔سرگودھا کے ادبی افق پر متعدد اہلِ قلم نمایاں ہیں ان میں ارشد محمود ارشد نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔زیر نظر شعری مجموعہ!بساطِ زیست؛کو راولپنڈی کی حرف اکیڈمی نے شائع کیا ہے جس میں ارشد محمود ارشد کی ایک سو چار غزلیں اور دس نظمیں شامل ہیں نعت اور سلام بھی اس شعری مجموعہ کا حصہ ہیں۔ارشد محمود ارشد کی شاعری کا جائزہ لیں تو اس میں زیستِ انسانی کے تمام رنگ اور موضوعات ملتے ہیں۔اس کو روشنی، امید اور الفت و چاہت کا شاعر کہا جائے تو بے جا نہیں ہو گا ارشد محمود ارشد انسانی مکالموں کو اشعار کے قالب میں ڈھالنے کا فن خوب جانتے ہیں اس طرح وہ درختوں، پرندوں اور پھولوں سے ہم کلام ہوتے ہیں،ان کی سنتے ہیں اور اپنی سناتے ہیں۔ارشد محمود ارشد کے یہاں دکھ درد کے اندھیرے کی منظر کشی ملتی ہے اور اس اندھیرے میں امید کے جگنو بھی دکھائی دیتے ہیں۔وہ خوش خیال سخن ور ہیں،درد کا احساس بھی رکھتے ہیں اور مسرت بھرے لمحات کی امید کا دامن بھی مضبوطی سے تھامے دکھائی دیتے ہیں۔وہ عزم اور ہمت کی بات کچھ اس طرح کرتے ہیں:

میرے اس عزم کو دیکھا تو فلک بوس کئی
آڑھی ترچھی سی چٹانوں نے بھی رستہ چھوڑا
دن بدلتے نہیں ہیں رونے سے
حوصلہ ! دیکھ حوصلہ میرے دوست

ارشد محمود ارشد کی شاعری میں درخت اور پرندوں کا ذکر موجود ہے وہ درختوں اور پرندوں سے مکالمہ کرتے ہیں اور اس حوالے سے اپنی بات انسانوں تک پہنچاتے ہیں درخت اور پرندے ایسی علامات ہیں جو بساط زیست کا پتہ دیتی ہیں اور اس بساط کو مات یا فتح کا ذریعہ بیان کرتی ہیں۔ انھوں نے خوبصورت مضامین باندھے ہیں اور الفاظ کے چناؤ میں نہایت نفاست اور سلیقے سے کام لیا ہے۔

گھنے درخت کے سائے میں جب قیام ہوا
میں پہلی بار پرندوں سے ہم کلام ہوا
اسی کے ہاتھ پہ بیعت میں کر کے آیا ہوں
جو بوڑھا پیڑ کڑی دھوپ میں کھڑا ہوا ہے
بساطِ زیست پہ اس نے مجھے یوں رکھا ہے
کہیں ہوں میں جو پیادہ تو شہسوار بھی ہوں

ارشد محمود ارشد کے لطیف جذبات واحساسات اور تجربات شعر و نغمہ میں ڈھلتے ہیں تو اظہار کا ایک خوبصورت انداز سامنے آتا ہے جس میں درد اور کرب میں ڈوبی ہوئی فریاد اور مسرت واطمینان سے لبریز آواز ایک ساتھ سنائی دیتی ہے ارشد محمود ارشد کی شاعری میں اظہار وابلاغ کا عنصر نمایاں ہے فکر وخیال کی رنگینی سے سجے مصرعے دل پر خوشگوار اثرات مرتب کرتے ہیں، وہ اظہار کے فطری راستے کھوٹے کرنے سے گریز کرتے ہیں اور ہر وہ قول جو سچا اور کھرا ہے اس کو شعر کے قالب میں ڈھالنے میں لمحہ بھر بھی تاخیر نہیں کرتے۔ ان کی شاعری مطالعاتی اور مشاہداتی تسلسل کی آئینہ دار ہے جو بات کرتے ہیں، وہ اثر رکھتی ہے کیونکہ وہ اندر کی صدا ہوتی ہے جو بیرونی فضاؤں میں گھل مل جاتی ہے۔

ان کی غزلوں کے کچھ رنگ اس طرح ہیں:

پہلے سوچ کے دھارے ماتم کرتے ہیں
اور پھر ہم تصویر ترا غم کرتے ہیں
شب سیاہ میں جگنو بھی اک غنیمت ہے
ذرا سا حوصلہ اندر کا ڈر نکالتا ہے

نجانے کونسی جنت کی جستجو ہے تجھے
کہ جس کے واسطے جینا مرا حرام ہوا
زرد آنکھوں میں کئی پھول کھلا سکتی ہے
وہ کسی روز میرے خواب میں آسکتی ہے

ارشد محمود ارشد کی شاعری روایت سے بھی جڑی ہے اور اس میں جدت بھی ہے۔ ہر وہ رنگ ہر وہ لفظ جس کا تعلق انسانی زندگی اور انسانی جذبات واحساسات سے ہے وہ ارشد کی شاعری میں کہیں نہ کہیں ہیروں کی طرح جڑاد کھائی دیتا ہے۔ روایت کا لبادہ، خیال کا دشت، نمود خاک، دست کمال اور وفا شعاری ایسے خوبصورت الفاظ ہیں جن کو نہایت خوبصورتی سے غزل کے شعروں کا حصہ بنایا گیا۔ ان سے ہر مصرع کی شان میں اضافہ ہوتا ہے۔

لبادہ اوڑھ کے رکھتا ہوں میں روایت کا
خیال دشت کا اک شتر بے مہار بھی ہوں
خودی کے زعم میں ایسا وہ مبتلا ہوا ہے
جو آدمی بھی نہیں تھا وہ اب خدا ہوا ہے
بوڑھے پیڑ کی چھاؤں کیسے بانٹو گے
آنگن میں دیوار اٹھانا ٹھیک نہیں

ارشد محمود ارشد کے اکثر شعر چونکا دینے والے ہیں وہ اپنی بات ڈھنگ اور سلیقے سے کرنا جانتے ہیں وہ اظہار کا ایسا انداز اختیار کرتے ہیں کہ پڑھنے والا بے ساختہ انھیں خراج پیش کرتا ہے، انھوں نے ذات کے حوالے سے اجتماعی سوچ اور شعور کی بات کی ہے۔ ان شعروں میں دیکھیں کہ انھوں نے آشکار، بے مہار، وفا شعار اور بے قرار کو کس طرح ہیروں کی طرح جڑا ہے زبان اور بیان دونوں کے اعلیٰ معیار کا اظہار ہے۔

عدو سمجھتا ہوں جس کو اس کا یار بھی ہوں
چھپا ہوا ہوں زمانے پہ آشکار بھی ہوں
لبادہ اوڑھ کے رکھتا ہوں میں روایت کا
خیال دشت کا اک شتر بے مہار بھی ہوں
میں اپنے آپ سے کر سکتا ہوں دغا بازی
اور ایک وصف ہے مجھ میں ، وفا شعار بھی ہوں

دنیا انسان کا عارضی ٹھکانہ ہے انسان لاکھ اپنی زندگی کو محفوظ کرنے کی تگ و دو کرے اپنی جان کی حفاظت کے لیے پہرے بٹھائے لیکن جو وقت مقرر ہے وہ اس سے ادھر ادھر ایک سانس بھی زیادہ نہیں لے سکتا۔ قضا کو کون ٹال سکتا ہے؟ عمر تمام ہوتی ہے تو تمام حیلے بہانے اور طاقت کے ترانے سب اپنے انجام کو پہنچ جاتے ہیں، ارشد محمود ارشد کہتے ہیں :

کٹتے ہی ڈور سانس کی ، نام ونمود خاک
ہونا ہے ایک روز یہ قصر وجود

محبت کی خاطر ہجرت صدیوں سے ہوتی چلی آئی ہے، الفت کا زبانی اقرار نہ کرے کوئی تو آنکھیں اعتراف اور اقرار الفت کرتی دکھائی دیتی ہیں، زمین سے رشتہ بہت مضبوط ہوتا ہے اور جب محبت آڑے آجائے تو یہ رشتہ پھیکا پڑ جاتا ہے، اپنی مٹی کی چاہت پر محبت غالب آجاتی ہے۔ اپنی کیفیات اور جذبوں کا ارشد محمود ارشد نے ایک غزل میں خوبصورتی سے بیان کیا ہے اور محبت کے جذبے اور محبت کی قوت کی شدت کو اشعار کے قالب میں ڈھال کر فن شاعری کا ایک قابل رشک نمونہ پیش کیا ہے، ارشد محمود ارشد کہتے ہیں:

اس میں کیا بات مری جان وضاحت کی ہے
صاف آنکھوں میں لکھا ہے کہ محبت کی ہے
پاؤں پڑے تھے بہت گاؤں کی مٹی نے مرے
کتنی مشکل سے ترے شہر کو ہجرت کی ہے
لوگ اب ایسے وفاؤں کا صلہ مانگتے ہیں
جیسے الفت بھی کوئی جنس تجارت کی ہے
میری معصوم کی چڑیا نہ عتابوں سے الجھ
تجھ کو اک دوست سمجھ کر یہ نصیحت کی ہے

محبت زندگی کا دوسرا نام ہے جو لوگ زندگی کو محبت جان کر گزارتے ہیں وہ اس کی تلاش کے سفر میں پیش آنے والی مشکلات اور مصائب سے نہیں گھراتے آبلہ پائی اور دھوپ کی تپش محبت کے متلاشیوں کا راستہ کھوٹا نہیں کر سکتے وہ یاد کے سائے میں اپنے سفر کو رواں رکھتا ہے یہ سب جذبے، محبت اور لگن کی شدت کے کمالات ہیں دنیا میں جفاکاروں کی اجارہ داری ہے دوستی کی کھال میں بھیڑیے محبت کے ماروں کے وجود کو کھانے پر تلے بیٹھے ہیں یہ زمانے کا سفاکانہ چلن ہے جو صدیوں سے چلا آرہا ہے ارشد محمود ارشد نے الفت کی راہوں کے مصائب اور ان کا بہادری کے ساتھ مقابلہ کرنے کے غیر

متزلزل جذبے کی عکاسی کی ہے اور ساتھ ہی ان درندوں کا ذکر کیا ہے جو دوستی کی کھال اوڑھ کر مکاری کے ساتھ دوست کے وجود کو بے وجود کر دیتے ہیں، ارشد محمود ارشد کہتے ہیں:

لمبا سفر تھا ، آبلہ پائی تھی ، دھوپ تھی
میں تھا تمھاری یاد کا سایہ تھا اور بس
اک بھیڑیا تھا دوستی کی کھال میں چھپا
اس نے مرے وجود کو کھایا تھا اور بس
پھر یوں ہوا ہوائیں تھیں رقصاں تمام رات
اک طاقچے میں دیپ جلایا تھا اور بس
اس کار زارِ زیست میں ہم نے تمام عمر
ارشد کسی کا عشق کمایا تھا اور بس

آج شاعروں کا ایک ہجوم ہے اور سخنوری کے بے شمار دعوے دار ہیں، ان میں چھوٹے بڑے کئی شاعر ہیں جو خود کو منوانے کے لیے سر توڑ کوششوں کو آزماتے رہتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ شعری جذبہ اور تخلیق کی صلاحیتوں پر کسی کی اجارہ داری نہیں جو شعر گو ان خوبیوں اور صلاحیتوں سے مالا مال ہوتے ہیں ان کی شاعری کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ارشد محمود ارشد ایسے ہی باصلاحیت شاعروں میں شمار ہوتے ہیں، ان کا ایک رنگ غزل اس طرح ہے جس میں اپنے فکر و فن کے اظہار میں بھرپور انداز میں کامران ہوتے دکھائی دیتے ہیں:

چاہت میں کوئی ضابطہ رکھا نہیں کبھی
سود و زیاں کا ہم نے تو سوچا نہیں کبھی
جس میں تمہارے روپ کا پرتو دکھائی دے
چہرہ ہماری آنکھ نے دیکھا نہیں کبھی
جو آدمی کے درد کو محسوس نہ کریں
ان پتھروں کو ہم نے تو پوجا نہیں کبھی
اڑ جائے تیرا روپ نہ تپتی نگاہ سے
جی بھر کے تجھ کو اس لیے دیکھا نہیں کبھی

اگر ہم ارشد محمود ارشد کی غزلوں کا فن کے حوالے سے جائزہ لیں تو لگتا ہے کہ ان کا نظریہ فن مشق سخن ہے، اس مشق کے نتیجہ میں جو کلام تخلیق پاتا ہے وہ مشق سخن میں تسلسل کی گواہی دیتا ہے۔ انھوں نے اپنے خیالات کو اس طرح نظم کیا ہے وہ پڑھنے والے خیالات میں بدل جاتے ہیں۔ زندگی

خوشی اور غمی کا مجموعہ ہے، یہ دونوں رنگ اور کیفیات ہر شخص کے حصہ میں آتے ہیں۔ اگر کسی کی زندگی عزم اور جہد مسلسل سے عبارت ہے تو کسی کی داستان زیست محبت کی تلاش پر مبنی ہے۔ انسانی زندگی کے اہداف بہت حسین اور دل پذیر ہوتے ہیں ان اہداف کے حصول کے لیے ہر شخص اپنی بساط کے مطابق کوشاں رہتا ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ان اہداف کو حاصل کر پاتے ہیں لیکن تمام اہداف کا حصول بہت دشوار ہے۔ بے شمار ایسے لوگ ہیں جو اپنے اہداف کے قریب جا کر حوصلے ہار جاتے ہیں اور سخت جدو جہد کو ادھورا چھوڑ کر مایوسی کے عالم میں الٹے پاؤں لوٹ جاتے ہیں۔ ارشد محمود ارشد کی شاعری میں دکھ اور غم کا اظہار پوری شدت اور پر اثر الفاظ کے ساتھ ملتا ہے غم، ہجر اور ناکامی کی کیفیات کو بیان کرتے ہوئے ارشد محمود ارشد روشن خیالی، مثبت گمانی اور خوش امیدی کا دامن نہیں چھوڑتے۔ ارشد کی اس غزل میں الم کی کیفیات کو بیان کیا گیا ہے اور ساتھ ہی ثابت قدمی اور مستقل مزاجی کا بھی حوالہ ہے۔ ارشد کہتے ہیں تم مجھے جہاں چھوڑ کر گئے تھے میں اس حالت میں موجود ہوں۔ اس غزل میں محبت کے جذبوں کی استقامت اور پختگی کا اظہار شامل ہے:

ایک بجھتا ہوا دیا ہوں میں
آخری سانس پر کھڑا ہوں میں

میں غم اٹھا کے بھی مسکراتا ہوں
کونسی خاک سے بنا ہوں میں

تو جہاں پھینک کر گیا تھا مجھے
دیکھ اب بھی وہیں پڑا ہوں میں

روز مجھ کو اچھال دیتی ہیں
روز آنکھوں میں ڈوبتا ہوں میں

اب جو چاہے سلوک کر مجھ سے
تیرے در پہ جو آ گیا ہوں میں

اپنی میت اٹھائے پھرتا ہوں
ایک مدت سے مر چکا ہوں میں

بات کرنا ذرا سلیقے سے
تیرے قد سے بہت بڑا ہوں میں

رعب مجھ پر نہ ڈال باتوں کا
تیرے جیسا ہی سر پھرا ہوں میں

شاعر اپنی محبوبہ سے ہم کلام ہوتا ہے تو اس مکالمہ میں جذبات کا اظہار، خواہشوں اور امنگوں کے پھول کھلتے اور مہکتے محسوس ہوتے ہیں۔ شاعر نے اپنی غزل سے اپنی محبوبہ سے کچھ اس طرح کا مکالمہ کیا ہے کہ اس سے ارشد کی محبت اور بے لوث چاہت کے ساتھ اپنے محبت سے لبریز وجود کا احساس دلاتا ہے۔ اس کے اظہار میں معصومیت اور سادگی کے ساتھ بے باکی اور بانک پن شامل ہے۔ محبوب کے ساتھ مکالمہ میں محبت کے اظہار کے انوکھے رنگ سجانا اور نئی روایات کو نبھانا ارشد محمود ارشد کا ہی کام ہے، وہ کہتے ہیں:۔

کالی زلف کا لوہا منوا سکتی ہو
میری سوچ کے سورج پر چھا سکتی ہو
دیکھو ! تیور بدل رہا ہے موسم کا
تم چاہو تو چھتری میں آ سکتی ہو
سچ مچ کوئل جیسا میٹھا لہجہ ہے
کیا تم میری کچھ غزلیں گا سکتی ہو
انٹرول سے آگے اصل کہانی ہے
اٹھ کے جانا چاہو تو جا سکتی ہو
بھولی بھالی صورت سے یوں لگتا ہے
چکنی چپڑی باتوں میں آ سکتی ہو
تشنہ آنکھوں کی ایسے کچھ پیاس بجھے
ایسا کوئی منظر دکھلا سکتی ہو

ارشد محمود ارشد کا پہلا شعری مجموعہ عجب سی بے قراری ہے" شائع ہوا، ایک سال بعد دوسرا مجموعہ " بھی یاد آؤں تو منظر عام پر آیا، تیسرا مجموعہ شام کی دہلیز پر تھا۔ ارشد محمود ارشد نے محبت بانٹ لیتے ہیں"" نبی ﷺ کا قصیدہ"، "تمھاری یاد کا موسم، اور" کوئی تعبیر دو مجھ کو" کے عنوان سے چار شعری انتخاب بھی مرتب کیے اور اب بساط زیست ہے جو زیر نظر ہے اور ان میں شائع ہونے والی غزلوں اور نظموں کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔ ان کی شاعری کی تفہیم کے لیے ان کے شاعری کے سفر کا ہر پہلو سے جائزہ لینا ناگزیر ہے۔ ارشد محمود ارشد کے شعری موضوعات بنیادی نوعیت کے ہیں جو انسانی زندگی اور انسانی رویوں کا احاطہ کرتے ہیں ادب جس صنف میں ہو اگر اس کا تعلق زندگی کے معاملات سے نہیں ہو گا تو اس کو کسی طور پر بھی پذیرائی نہیں مل پائے گی۔ ارشد محمود ارشد کی شاعری کا محور محبت اور سماجی و معاشرتی شعور ہے اور اس شعور سے پھوٹنے والی روشنی ہے، اس روشنی میں ڈھلے

ارشد محمود ارشد کے اشعار شعور و آگہی کی منزل کا پتہ دیتے ہیں۔ وہ ایک ماہر سنگ تراش کی طرح پہاڑ کو توڑ کر اور اس کو سنگ تراشی کے اچانک ماہرانہ استعمال سے تراش کر ایسے شاہکار تخلیق کرتے ہیں کہ اس کو دیکھنے والا دنگ رہ جاتا ہے۔ الفاظ کو تراش کر اس کو غزل کے خوبصورت بت کدے میں سجا دیتا ہے، پتھر کے صنم الفاظ کی کاری گری سے سانس لیتے دکھائی دیتے ہیں۔ ارشد محمود ارشد کی سانس لیتی شاعری کے چند نمونے اس طرح ہیں:

چراغوں کو جلانے کی لگن میں
ہواؤں سے عداوت بڑھ گئی ہے

مجھے اک جل پری نے چھو لیا تھا
مری سانسوں کی حدت بڑھ گئی ہے

چشم نم ناک میں اُگی بارش
پھر بڑی دیر تک ہوئی بارش

دل سمندر سے بن گیا صحرا
تو نے بخشی نہ پیار کی بارش

ارشد محمود ارشد کی غزلوں کی طرح اس کی نظموں میں بھی مختلف رنگ ملتے ہیں۔ ان رنگوں کو اس حقیقت سے سجایا گیا کہ زندگی کا کرب بھی حسین لگنے لگتا ہے۔ ان کی نظموں کے عنوان اور شعری اسلوب اعلی فکری و فنی معیار کا اظہار کرتے ہیں۔ موجودہ دور میں نثری نظم کو بڑی پذیرائی ملی ہے۔ ارشد محمود ارشد کی نظموں کے مصرعوں کے مضامین تفکر انگیز ہیں۔ نثری نظم کو آج کی مقبول شعری اصناف میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان کو اثر انگیز اور مقبول بنانے کے لیے ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ارشد محمود ارشد کی نظموں میں یہ خوبی واضح دکھائی دیتی ہے، ان کی نظم "قیدی سے کچھ مصرعے دیکھیے:

محبت کے سفر میں تو
کوئی منزل نہیں ہوئی

کہ تپتے ریگزاروں میں

ہمیشہ چلنا پڑتا ہے

یہ ایسا کھیل ہے جس میں

جہاں پر جیت ہوتی ہے

فقط جو قرب پانے کو

محبت نام دیتے ہیں

بہت نادان ہوتے ہیں

ارشد محمود ارشد کی نظم "بیوپار" کاروبارِ زندگی کی عکاسی کرتی ہے،اس میں خوابوں اور خوابوں کے دام کا ذکر ہے، بازار میں خوابوں کے دام میں مندے کی بھی بات کی گئی ہے۔

لاؤ مجھ کو دکھلاؤ تو

آنکھوں میں ہیں کیسے خواب

کچے ہیں یا پکے خواب

اچھا ان کے دام بتاؤ

دیکھو اتنا ذہن میں رکھنا

اس بازار میں خوابوں کے دام اب گرے ہیں

تجھ کو میں اک بات بتاؤں

برسوں پہلے میں نے بھی یہ کام کیا تھا

خواب بنے تھے خواب تھے بیچے

کبھی میں یاد آؤں تو۔ کے لیے چند سطریں

میثم علی آغا۔۔سیالکوٹ

ادبی ذوق کی اقدار پر کھنے سے پہلے یہ بات جان لینی چاہئیے کہ ادب کا سوال بعد میں اٹھتا ہے اور ادب کا ذوق پہلے۔۔۔ جو ادب ہم تک پہنچا ہے وہ تہذیب اور تمدن کا پالا ہوا ہے۔ ذوق زندگی کے ساتھ شروع ہوتا ہے یہ صحیح ہے کہ تہذیب اور تمدن بھی ذوق کی تشکیل کے لوازمات ہیں لیکن اس کی بنیادی ہیئت میں زیادہ حصہ نسل کا ہی ہوتا ہے۔ ادب کا نہیں۔۔۔ ذوق سماج کی ایک مخصوص حالت میں نشو و نما پاتا ہے۔ دنیا کی ابتدائی نسلیں چند اوصاف کو پسند کرتی تھیں اور چند کو نہیں ان کے نزدیک، بہادری، استقلال، اپنوں سے انتہائی عقیدت، بڑی اور قابل ستائیش چیزیں تھیں۔ ایک نظرے سے ایک آدرش ہے ایسی عقیدت کا کوئی معیار ان کے پاس نہیں تھا ہومر کے سارے کلام میں ایک ہی نظریے یعنی قوم سے عقیدت کا احساس واضح جھلکتا ہے۔۔ اسی طرح ایلیکیس نے اپنی تحاریر میں قومی اہمیت کا کوئی ذکر نہیں کیا۔۔ اس سلسلے میں مارکسی نظریہ کسی حد تک ٹھیک کہا جا سکتا ہے اس کے نزدیک ادب کا وہ حصہ زیادہ اہمیت کا حامل ہے جس کا تعلق ابتدائی رسومات پر ستش سے ہے۔ ادب کا ایک بڑا حصہ ایسا بھی ہے جو صرف فرد کے سہارے آگے بڑھتا ہے۔ ادبی ذوق انہی دو قوتوں کے سمجھوتوں اور باہمی امتزاج کا نتیجہ ہے اس کو مزید آسان کرتے ہوئے ہم کہنے میں حق بجانب ہیں کہ انگریزی ادب کا بڑا حصہ جن بڑے رائڑوں کی بدولت ہمارے سامنے ہے ان میں سے ہی کئی ایک خود ایک دوسرے کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتے۔۔۔ یہ مثال صرف انگریزی ادب کے لیے ہی صادق نہیں آتی بلکہ دنیا کے ہر ادب پر یہ مثال دی جا سکتی ہے۔ خود اردو ادب کا یہی حال ہے۔۔۔ صرف گزشتہ عہد ہی نہیں آج کا عہد بھی ایسی صورتحال سے دو چار ہے۔ غزل ایک ایسی صنف ہے جسے اس صدی کی سب سے بڑی شعری صنف ہونے کا شرف حاصل ہے۔۔ نوجوان شعرا کی جو کھیپ غزل کی آرائش و زیبائش میں دن رات کوشاں ہے انہی میں ایک نام ارشد محمود ارشد کا ہے۔ ارشد محمود کا تعلق سرگودھا کی زرخیز دھرتی سے ہے یہ وہ دھرتی ہے جس نے زندگی کے تمام شعبوں میں نامور لوگ پیدا کیے ادب اور بالخصوص شعری ادب میں بے تحاشہ نام اس دھرتی کے سینے پر تمغہ بن کر چمک رہے ہیں۔ ارشد محمود ارشد نوجوان شعراء کی ایسی جماعت سے ہے جو خالصتاً ادب کی خدمت کے لیے کمر بستہ ہیں مختصر سے عرصے میں اس نوجوان نے جو نام اور مقام بنایا ہے یہ اس کی ادب دوستی اور ادب پرستی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ارشد محمود ارشد کا پہلا شعری مجموعہ،، عجب سی بے قراری ہے،، جب مارکیٹ میں،،اِن،، ہوا تو ادبی حلقوں میں خاصی پذیرائی ہوئی۔ امید کی جا رہی تھی یہ نوجوان بہت جلد اپنا نام بنائے گا اور ایسا ہی ہوا۔۔۔ اس کا دوسرا شعری مجموعہ،، کبھی میں یاد آؤں تو ،،،، میرے سامنے ہے۔۔ جس کی ستر فیصد شاعری میں مختلف میگزین میں پڑھ چکا ہوں۔ ریشم

کا ادبی صفحہ میرے پاس آیا تو میری اولین کوشش تھی کہ نئے اور اچھے شعراء سے رابطہ کر کے انہیں ساتھ لے کر ان کے مشوروں سے اس کو مزید بہتر کیا جائے مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ ارشد محمود ارشد ان دوستوں میں سے ہے جس نے ہمیشہ ہمیں اچھے مشوروں اور اچھی تحریروں سے نوازا ہے۔ارشد کی تمام شاعری خوبصورت ہے۔مجھے اس کی شاعری پہ کوئی ایک جملہ کہہ کر اس کی شاعری کو ایک ہی نہج تک محدود نہیں کرنا ویسے بھی اچھی شاعری خود بخود دل میں اترتی ہے اور رستہ بناتی جاتی ہے۔ارشد بنیادی طور پر غزل کا شاعر ہے اگرچہ اس نے کتاب کے آخر میں چند نظمیں بھی شامل کی ہیں تاہم وہ غزل مزاج ہے اور آشنا بھی غزل سے ہے۔۔۔میں اس کی نظم پر کوئی قدغن نہیں لگا رہا مگر میرا پر خلوص مشورہ ہے کہ اسے غزل کی جانب ہی اپنی توجہ مبذول رکھنی چاہئیے۔۔چونکہ غزل اور بالخصوص جدید غزل کا کینوس بہت وسیع ہے۔۔۔ارشد محمود ارشد میرا بہت اچھا دوست ہے اور ریشم کے ہر قاری کا پسندیدہ شاعر ہے۔مجھے امید ہے وہ آنے والے دنوں کا خوبصورت ترین شاعر بن کر ادبی افق پر چمکتا دکھائی دے گا۔

شاید میرے نصیب میں ہے تشنگی ابھی
دریا کے پاس رہ کے بھی پیاسا ہوں آج بھی
جس کو مرے نصیب میں لکھا نہیں گیا
ارشد میں بدنصیب اسی کا ہوں آج بھی
تیری باتیں اور یادیں رات بھر لکھتا رہا
صبح دم تھی کاغذوں پر شاعری بکھری ہوئی
اترا ہے آج کیا یہ سورج زمین پر
ہر شخص کو ہیں جان کے لالے پڑے ہوئے
بدن تو ٹوٹ رہا تھا مگر انا تھی ابھی
تمہارے در سے پلٹ آئے ہم صدا کے بغیر
اڑ جائے تیرا روپ نہ تپتی نگاہ سے
جی بھر کے تجھ کو اس لیے دیکھا نہیں کبھی

ارشد محمود ارشد جواں جذبوں اور کومل و شستہ سوچوں کا شاعر ہے ابھی وہ جوان ہے اس کے جذبے جوان اور امنگیں تازہ دم ہیں ابھی نہت سے کوہسا اس کی راہ میں ہیں میری دعا ہے وہ یونہی کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہو

عجب سی بے قراری ہے،، میری نظر میں

ذوالفقار احسن۔۔سرگودھا

ادبی اُفق پر رنگ و نور کی کئی کہکشائیں دکھائی دے رہی ہیں۔جنہوں نے آسمانِ ادب پر کتنے ہی خوش رنگ اور خوشنما ستارے بکھیر دیئے ہیں اور جن کی روشنی سے پورا اگگن جگما اُٹھا ہے انہیں کہکشاؤں کا ایک ستارہ ارشد محمود ارشد ہے جس نے انتہائی قلیل عرصہ میں اپنی روشنی سے ایسے ہالے بنائے ہیں کہ ایک علیحدہ کہکشاں بنتی نظر آرہی ہے۔ارشد محمود ارشد کے شعری مجموعے،،عجب سی بے قراری ہے،، میں داخلیت اور خارجیت کی دونوں حوالوں سے بھرپور عکاسی نظر آتی ہے۔ارشد نے وارداتِ قلبی کو کچھ اس طرح شعروں کے قالب میں ڈھالا ہے کہ ہر پڑھنے والا دل گرفتہ ہوا چلا جاتا ہے۔ان کی شاعری میں بلاشبہ رومان بدرجہ اتم موجود ہے مگر ارشد عام نوجوانوں کی طرح محض رومان ہی نہیں بلکہ زندگی کے تلخ روئیوں کی بات بھی کرتا دکھائی دیتا ہے۔ارشد محمود ارشد کی شاعری اسی لیے معاشرتی اور سماجی قدروں کا پورا پورا ساتھ دیتی ہوئی نظر آتی ہے۔

ارشد محمود ارشد کی شاعری میں محبوب سے بے تکلفی کا جو انداز ملا ہے وہ انتہائی ریاضت کا متقاضی ہوا کرتا ہے ارشد کہتا ہے:

کہا میں نے ، کہ میرا دل، تو وہ اٹھلا کے یوں بولے
کرو قابو وگرنہ دل تمہارا کھو بھی سکتا ہے

ارشد کی شاعری میں،،کانٹوں کی علامت جو اُبھر کر سامنے آئی ہے وہ قاری پر واضح کرتی ہے کہ ارشد کو پھولوں سے ہی نہیں کانٹوں سے بھی محبت ہے۔اس لیے محبت ہے کہ کانٹے دکھوں، غموں، مصیبتوں کی صورت ہمیشہ ساتھ دیتے ہیں ارشد نے بھی کانٹوں کے ساتھ کو معتبر جانا ہے اسی لیے کہا ہے:

گلوں سے کچھ نہیں لینا ہمیں ہے کام کانٹوں سے
کہ ہم نے دل پہ لکھا ہے تمہارا نام کانٹوں سے
لگی ہے قدر گرنے اب شبانہ روز پھولوں کی
بنا ڈالا کسی نے کیا کوئی شہکار کانٹوں کا؟

غزل کی ابتدا میں گیت کی بودو باش کو شامل رکھا جاتا رہا ہے پھر یوں ہوا کہ غزل اپنا ارتقائی سفر طے کرتی رہی اور آہستہ آہستہ گیت کی ساری بودو باش ختم ہوتی چلی گئی اور غزل صرف غزل کے طور پر ہی لکھی اور کہی جانے لگی۔ ارشد محمود ارشد کی غزلوں کا بنظر غائر مطالعہ کرنے کے بعد یوں محسوس ہوا ہے کہ ان کی غزلوں میں گیت کی بودو باش موجود ہے۔ شاید اس کی وجہ ان کی غزلوں کی ،،ردیف،، بھی ہو سکتی ہے کیونکہ ارشد کے ہاں ہمیں ردیف ایسی روانی والی ملتی ہیں کہ ہمیں خواہ مخواہ گیت کا دھوکہ سا ہونے لگتا ہے۔ میں اپنی اس بات کی دلیل میں چند اشعار پیش کرنا چاہوں گا

شبِ ہجراں ستاتی ہے اُداسی گھیر لیتی ہے
تمہاری یاد آتی ہے اُداسی گھیر لیتی ہے
تمہاری یاد کی کوئل جو دل کے اجڑے گلشن میں
کوئی نغمہ سناتی ہے اُداسی گھیر لیتی ہے

ہمیں دل سے بھلا ڈالا بہت اچھا کیا تو نے
کہ خوابوں کو جلا ڈالا بہت اچھا کیا تو نے

بچھڑنا اک حقیقت ہے ذرا سی دیر رک جاؤ
بڑی بے چین حالت ہے ذرا سی دیر رک جاؤ

جہاں بھی ہو پلٹ آؤ محبت کا تقاضا ہے
دکھی دل کو نہ تڑپاؤ محبت کا تقاضا ہے

ایسے کئی اشعار ارشد کے مجموعہ کلام ،، عجب سی بے قراری ہے ،، کے قرطاس پر بکھرے پڑے ہیں۔ جن کو پڑھتے ہوئے گیت کا گماں ہونے لگتا ہے ارشد کے ہاں کسی کے بچھڑ جانے کا کرب ، دکھ بھی جا بجا ملتا ہے تصور کے کینوس پر جب کوئی چہرہ اُبھرتا ہے تو ارشد فرطِ جذبات میں پلکوں پہ چمکتے ہوئے جگنو سے محسوس کرنے لگتا ہے۔ یہ جگنو اس کی شاعری کا ایک اور مضبوط استعارہ کے طور پر اُبھر کر ہمارے سامنے آتا ہے

ارشد کہتا ہے:

کوئی بھولا ہوا چہرہ تصور میں جو آ جائے
تو فوراً جھلملاتے ہیں مری آنکھوں کے یہ جگنو

ٹھہر جاتے ہیں آ کر جو مری پلکوں کی نوکوں پر
تو پھر نیندیں اُڑاتے ہیں مری آنکھوں کے یہ جگنو

ارشد کے ہاں بچپن کی معصوم اور حسین یادوں اور چھوٹی چھوٹی خواہشات اس طرح ہمارے سامنے آتی ہیں اور یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ جیسے ہم بچپن کے اس عہد زریں میں واپس لوٹ آئے ہوں جہاں تتلی کے پیچھے بھاگنا، جگنوؤں کو پکڑنا زندگی کا اہم ترین مقصد ہو، دو تین اشعار ملاحظہ ہوں:

تتلی جگنو دیکھ ہم تم شور مچایا کرتے تھے
اُڑتے پنچھی دیکھ کے ان کے پیچھے بھاگا کرتے تھے

پھول کتابیں ، خوشبوئیں اور پیار کی ساری سوغاتیں
چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی ہم سینت کے رکھا کرتے تھے

،، عجب سی بے قراری ہے،، میں نظمیں بھی شامل ہیں جو تمام کی تمام رومانی رنگ میں رنگی ہوئی ہیں ،، عجب سی بے قراری ہے، کی اشاعت یقیناً ایک خوشگوار تازہ ہوا کا جھونکا ہے مجھے امید واثق ہے کہ ارشد نے اگر یونہی اپنا ادبی سفر جاری رکھا تو وہ یقناً غزل میں نام پیدا کرے گا۔ ان کے اولین شعری مجموعہ پر میں انہیں دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں اور دعا ہے کہ وہ ہمیشہ اسی طرح فعال رہیں۔

شعری ادب کا تسلسل

باقی احمد پوری۔۔لاہور

اُردو ادب کے حوالے سے دبستانِ سرگودھا کی اپنی ہی پہچان ہے۔غزل، نظم، نثر، اور تنقید کے میدان میں بے شمار مشاہیر کے نام لیے جا سکتے ہیں جن کا اس سرزمین ادب سے تعلق ہے۔

ارشدؔ محمود ارشد بھی سرگودھا کا ایک معروف نوجوان شاعر ہے " کبھی میں یاد آؤں تو....." ارشد کا دوسرا مجموعہ کلام ہے۔اس کا پہلا مجموعہ میری نظر سے نہیں گزرا البتہ مختلف جرائد ورسائل میں اس کا کلام گاہے بہ گاہے میری نظروں سے گزرتا رہتا ہے۔

اردو ادب کے ایک قاری کی حیثیت سے میں میرؔ، غالبؔ، سوداؔ، مصحفیؔ، مومنؔ، عرفیؔ، حافظؔ اور دیگر اساتذہ کا کلام بار بار پڑھتا رہتا ہوں۔اس سے مجھے تحریک سخن بھی ملتی ہے اور پیرائے اظہار کی رہنمائی بھی۔اپنے عہد کے دیگر نامور شعراء اور نوجوان شاعروں کا کلام بھی میں دلچسپی سے پڑھتا ہوں اس سے مجھے اندازہ ہوتا رہتا ہے کہ زبان وبیان میں کیا کیا تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں جو مستقبل میں اردو زبان کی تشکیل نو کا باعث بنیں گی۔زبان کی بعض تبدیلیاں مستقل حیثیت اختیار کر لیتی ہیں جبکہ بعض کمزور کوششوں کو زبان از خود فوراً رد کر دیتی ہے۔ہر زبان میں رد وقبول کا اپنا ایک سسٹم ہوتا ہے۔ اردو زبان میں بھی یہ قدرت موجود ہے۔خاص طور پر غزل کا یہ سسٹم تو بہت حساس نوعیت کا ہے ارشدؔ محمود ارشد کے زیر نظر مجموعہ کلام کا مطالعہ بھی میں نے اسی زاویے سے کیا ہے۔اس کے کلام میں مجھے ندرتِ خیال کے ساتھ ساتھ اظہار کے نئے انداز بھی نظر آئے ہیں۔کچھ الفاظ اس کی شاعری میں ایسے بھی نظر آئے جو اپنے روایتی معانی سے ہٹ کر استعمال کیے گئے ہیں۔مثلاً اردو میں " بازاری " کا لفظ اوباش قسم کے لوگوں کے لیے بولا جاتا ہے لیکن ارشد محمود نے کہا کہ:

لگاؤ دام چاہت کے تو یہ بھی ذہن میں رکھنا
ہر اک شے ہی زمانے میں تو بازاری نہیں ہوتی

اس شعر میں شاعر نے چاہت کو" بازاری " کی تہمت سے بھی بچایا ہے اور یہ بھی واضح کیا ہے کہ ہر چیز کی طرح چاہت بکاؤ مال نہیں ہوتی۔

کسی شاعر کی شاعری کو روایتی یا جدید کہنے کی روایت بھی اب فرسودہ سی ہو گئی ہے۔سائنس کی ترقی کے ساتھ علم وادب کی اقدار میں بھی بے پناہ تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔زبانوں کو اب تنگ دامانی کا احساس ہونے لگا ہے۔اس لیے زبانیں ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو رہی ہیں۔ نئی لسانی تشکیلات وجود میں آ رہی ہیں۔اصطلاحیں تبدیل ہو رہی ہیں۔کمپیوٹر نے مراسلت کے انداز بدل دیئے ہیں۔ محبوب کو خط لکھنے کا زمانہ بدل چکا ہے اور اس کی جگہ SMS اور CHAt نے لے لی ہے۔پیار کے آداب بھی بدل رہے ہیں اور اس کا اثر شاعروں کی شاعری پر بھی براہ راست پڑ رہا ہے۔خاص طور پر نوجوان نسل

کی شاعری پڑھ کر تو یہی تاثر قائم ہوتا ہے ۔ یہ کوئی بری بات بھی نہیں ہر اچھے شاعر کی شاعری اپنے زمانے کی نمائندگی بھی کرتی ہے۔ارشد کی غزل بھی اپنے عہد کی تصویر کشی کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

اس گھر پہ جانے کب سے ہیں تالے پڑے ہوئے
جالوں کے رنگ بھی تو ہیں کالے پڑے ہوئے
اس تیرگی کے راج کو توڑیں تو کس طرح
اس سوچ میں ہیں کب سے اجالے پڑے ہوئے

مجھے ارشد محمود کی چند غزلیں پڑھ کر خوشی ہوئی کہ اس نے غزل کی روایتی اقدار کو پامال نہیں کیا۔یہی ایک غزل گو کی کامیابی ہوتی ہے۔ارشد کے شعروں میں کسک ہے جو دلوں کو چھوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

سرِ ساحل تماشا دیکھتے ہو
کہ میں گرداب سے اُلجھا ہوا ہوں
نمٹ لوں گا میں ارشد دشمنوں سے
ابھی احباب سے الجھا ہوا ہوں

غزل کے حوالے سے اردو زبان اس عہد تک آتے آتے مالا مال ہو گئی ہے ۔ بے شمار محاورے ، اصطلاحیں، ندرت خیال، ہر رنگ ڈھنگ کے لہجے، ڈکشن، روایتیں، جدتیں، خیال و فکر کی رعنائیاں، گہرائیاں، استعارے، ترکیبیں، ردیفیں، قوافی، بحور، علامتیں، عروضی پابندیاں اور جلال و جمال یہ سب کچھ اردو غزل نے اردو زبان کو عطا کیا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اردو زبان میں جو چاشنی ہے وہ غزل کی بدولت ہے۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ شعری ادب کا تسلسل ہی کسی زبان کی ترقی اور بقا کا ضامن ہوتا ہے۔ ہر شاعر اپنی شاعری کے ذریعے شعری ادب کے تواتر کو آگے بڑھاتا ہے اور آج کا نوجوان شاعر ارشد محمود بھی اپنے عہد کے بہت سے دیگر شاعروں کی طرح اس کام میں لگا ہوا ہے۔

ہر عہد میں کسی خاص خطے، ملک یا علاقے کے لوگ اپنے ارد گرد کے ماحول کا مشاہدہ اپنے اپنے انداز میں کر رہے ہوتے ہیں۔ اس لیے ایک ہی وقت میں ایک ہی موضوع پر بہت سے لکھاری اپنے اپنے مشاہدات نظم و نثر میں لکھ رہے ہوتے ہیں اس طرح موضوع کی یکسانیت کے باوجود بے شمار تحریریں قارئین کی نظر سے گزرتی ہیں۔ جو لکھنے والوں کے جداگانہ لہجے کی بدولت قارئین پر اثر انداز ہوتی ہیں۔انسان صدیوں سے اس کرۂ ارض پر قیام پذیر ہے۔ انسانوں کے جذبات واحساسات اور مشاہدات کا DATA اتنا زیادہ ہو گیا ہے کہ اب ” نئے“ کا لفظ بہت پرانا لگنے لگا ہے۔اب یہ دعویٰ کرنا کہ فلاں موضوع پر پہلی بار میں نے قلم اٹھایا ہے“ ایک مزاحیہ سی بات لگتی ہے۔ ہاں جسے ہم

جدید طرزِ احساس کا نام دیتے ہیں وہ محض لہجے کی تبدیلی کا نام ہے۔ بیانیہ کی تلوار کاٹ دار ہونی چاہیے۔ بعض اوقات جہاں الفاظ کا استعمال عام اصطلاحی معنوں سے ہٹ کر کیا جائے وہاں بھی جدید طرزِ احساس کی جھلک نظر آنے لگتی ہے

غزل میں ردیف وقافیہ کی نئی بندش بھی غزل میں جدت کا رنگ بھر دیتی ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے کہ نیا خیال نئی بندشوں سے ملتا ہے۔ ارشد محمود ارشد کی زیر نظر کتاب میں بہت نئی ردیفیں نظر آتی ہیں۔

لکھ رہا ہے ایک مدت سے کہانی ریت پر
حسرتوں کی سیج پر ہے زندگی بکھری ہوئی

یوں تری یاد سے دل ہوا مضطرب
کھلیں گے پھول تو آئے گا تتلیوں کا ہجوم

ارشد محمود نے پامال زمینوں میں بھی غزلیں کہی ہیں اور کوشش کی ہے کہ ان زمینوں میں بھی نئے انداز سے اپنی بات کہی جائے۔ اسی طرح کی شعوری یا لاشعوری کاوشیں شاعر کو منفرد لب ولہجہ عطا کرتی ہیں، ارشد محمود ارشد نے شاعری کی سنگلاخ مگر معطر وادی میں قدم رکھا ہے جیسے جیسے وہ ان راہوں پر آگے بڑھتا رہے گا۔ اس کی سرشاری بھی بڑھتی رہے گی اور اسے یہ بھی آہستہ آہستہ معلوم ہو جائے گا کہ ان وادیوں میں سفر کے اصول و ضوابط کیا ہیں۔ میں صرف اتنا کہوں گا کہ اس جگہ حرف معتبر ہے شرط'' یہ حرف معتبر الہ دین کا چراغ نہیں کہ کسی کے ہاتھ نہ لگے۔ یہ تو ہر اس شاعر کی رسائی میں ہے جو اساتذہ کے کلام کا باقاعدگی سے اور دلچسپی سے مطالعہ جاری رکھتا ہے اردو تنقید سے رہنمائی حاصل کرتا ہے، دوسروں کی کوتاہیوں سے سبق حاصل کرتا ہے اور دوسرے شاعروں کے اچھے اشعار کی تحسین کرتا ہے۔ ارشد محمود ارشد کی لگن اور جذبے سے میں بخوبی اندازہ لگا سکتا ہوں کہ یہ نوجوان شاعر انشاء اللہ اس میدان سخن میں دن دونی رات چوگنی ترقی کرے گا۔

"کبھی میں یاد آؤں تو" پر ایک نظر

پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم گورنمنٹ انبالہ مسلم کالج سرگودھا

بجھتے ہوئے چراغوں سے کچھ نئے چراغ جلانے کی روایت بہت پرانی ہے مگر اسی طرح روشنی آگے سے آگے پھیلتی چلی جاتی ہے۔ شعر کہنا گویا موم بتی کی طرح دھیرے دھیرے سلگنے کا ایسا عمل ہے جس میں تخلیق کار خود بھی شامل ہوتا ہے اور جلنے کے عمل سے گزرتا ہے دبستانِ سرگودھا اس لحاظ سے انتہائی زرخیز ہے کہ یہاں کے فنکار جل جل کر کندن بن جاتے ہیں اور ان کے باطن سے پھوٹنے والی روشنی سے کئی کہکشائیں آسمان ادب پر نمودار ہوتی ہیں۔ یوں تو میرا تعارف نوجوان شعرا ذوالفقار احسن، عابد خورشید، صفدر رضا صفی، عابد سیال، مسعود تنہا، اسد اعوان، عاشر وکیل راؤ، ارشد ملک، عابد حسین عابد، اور ریاض ساجد سے بہت زیادہ قریبی ہے لیکن ارشد محمود ارشد کو پڑھنے اور سننے کا موقع بھی ملتا رہا ہے۔ ارشد محمود ارشد کا شمار سرگودھا کے ایسے نوجوان شعراء میں ہوتا ہے کہ جنھوں نے اپنی مشق سخن کا آغاز نئی صدی کے اوائل میں کیا۔

ارشد محمود ارشد نے بہت جلد پہلا شعری مجموعہ،، عجب سی بے قراری ہے،، اہل فن کے سامنے رکھا۔ اس مجموعہ پر دنیائے اردو غزل کے نامور شاعر و نقاد جناب ظفر اقبال نے اپنی قیمتی رائے سے نوازا۔ یہ مجموعہ ارشد محمود ارشد کے ابتدائی کلام پر مشتمل تھا۔ ارشد محمود ارشد کا حلقہ احباب چونکہ پورے پاکستان میں پھیلا ہوا ہے سو یہ کتاب بھی پورے پاکستان میں پھیل گئی۔ اس پر لاتعداد تبصرے بھی چھپے اور اُس کو خوب پذیرائی ملی۔

ارشد محمود ارشد غزل کہتے ہوئے غزل کے ان لوازمات کو بھی پورا کرتا ہے جو غزل کی جان ہیں۔ ان کے ہاں رنگ تغزل اپنے عروج پر ہے۔ ارشد محمود ارشد کے ہاں رومانوی رنگ بہت نمایاں ہے۔ ایسے ایسے نازک خیالات کو شعروں کے سانچے میں ڈھالتا ہے کہ قاری سرشاری کی کیفیت میں آکر جھوم اٹھتا ہے۔ ثبوت کے طور پر اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

بہت ہے وہ حسین ارشد ، پہ اس کے ہاتھ ٹھنڈے ہیں
سنا ہے ایسے لوگوں میں وفاداری نہیں ہوتی

دل تو ہے سینے میں لیکن دلبربا کوئی نہیں
اس طرح تو زندگانی کا مزہ کوئی نہیں

جب یادوں کے بادل ہل چل کرتے ہیں
بیٹھے لمحے آنکھیں جل تھل کرتے ہیں

ارشد محمود ارشد نوجوان شعرا کی طرح صرف اور صرف رومان پرور ہی نہیں بلکہ اس کے ہاں سماجی و

معاشرتی مسائل بھی ملتے ہیں وہ معاشرتی رویوں پر بھی بات کرتا ہے۔ وہ عدالتی نظام کے خلاف بھی نعرہ حق بلند کرتا ہے۔ وہ راہنماؤں سے بھی خوف زدہ ہے۔ وہ حبس کے موسم میں سانس لے رہا ہے وہ تازہ ہوا کا تمنائی ہے۔ وہ موجودہ نظام کے خلاف بھی آواز اٹھاتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ارشد ایک ایسا تخلیق کار ہے جو جبر اور ظلم کے خلاف نعرہ حق بلند کرنے کی جرات رکھتا ہے۔ اور یہ جرات بتاتی ہے کہ ان کے اندر کوئی شے ایسی ہے جو انہیں سچ کہنے پر اکساتی ہے۔ وہ کہتا ہے:

جہاں پر کوڑیوں کے مول میں انصاف بکتا ہے
وہاں مظلوم کو اکثر عدالت مار دیتی ہے

ہے کوئی رہبر نہ ہمدم راہنمائی کے لیے
رہ نہ جائیں راستے میں جگ ہنسائی کے لیے

ارشد محمود ارشد کے ہاں،، دریا، سمندر، ساحل، فرات، پانی، عزاداری، کربلا، صحرا، پیاس، ایسے مضبوط استعارے جا بجا موجود ہیں۔ جو واقعہ کربلا کی یاد دلاتے ہیں اس کے علاوہ ارشد محمود ارشد نے واقعہ کربلا کو بھی کئی شعروں میں بیان کیا ہے کہ

ایک دن ملنا تھا جس دھرتی میں خوں مظلوم کا
نام اس کا ہی ازل سے کربلا رکھا گیا

نکال سکتا نہیں ہوں میں دل سے حُبِ حسینؑ
وراثتوں میں ملی جو کہ اپنی ماں سے مجھے

ارشد محمود ارشد کا تازہ شعری مجموعہ،، کبھی میں یاد آؤں تو۔۔۔۔،، آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ میں نے پورا مجموعہ پڑھا ہے۔ مجھے اس کے ہاں رجائیت کا پہلو بہت نمایاں نظر آیا ہے۔ ارشد محمود ارشد کے پہلے مجموعہ،، عجب سی بے قراری ہے،، کے بعد،، کبھی میں یاد آؤں تو۔۔۔،، اس کی اڑان کا دوسرا مرحلہ ہے جس میں وہ بے حد کامیاب و کامران ہے۔ مجھے امید ہے کہ اگر ارشد نے اپنا شعری سفر جاری رکھا تو ایک دن ایسا ضرور آئے گا کہ ارشد اپنی الگ شناخت بنا لے گا۔ مجھے توقع ہے کہ اس شعری مجموعہ کی پذیرائی میں اہل فن اس کی حوصلہ افزائی میں فراخ دلی کا مظاہرہ کریں گے۔

"نئی نسل کے فکری و اُسلوبیاتی رجحانات"

اکرم کنجاہی۔۔کراچی

سرگودھا شعر گوئی اور تحقیق و تنقید کے حوالے سے اہم ادبی مراکز میں شمار ہوتا ہے۔آج بھی ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم، ڈاکٹر شاکر کنڈان، اخلاق عاطف، ڈاکٹر شفیق آصف، ذوالفقار احسن، نجمہ منصور، ممتاز عارف، ثمینہ گل، منزہ احتشام گوندل،آصف راز، ارشد محمود ارشد، مرتضےٰ حسن جیسے اہل قلم علم و ادب کی خدمت میں مشغول ہیں۔ نئی نسل کے فکری اور اُسلوبیاتی میلانات کو واضح کرنے کے لیے سرگودھا سے تعلق رکھنے والے معروف شاعر ارشد محمود ارشد کی ایک غزل اور اُس کا انتقادی جائزہ پیش کرتا ہوں۔ملاحظ کیجیے :

زمیں کی کوکھ سے پہلے شجر نکالتا ہے
وہ اس کے بعد پرندوں کے پر نکالتا ہے
شبِ سیاہ میں جگنو بھی اک غنیمت ہے
ذرا سا حوصلہ اندر کا ڈر نکالتا ہے
کہ بوڑھے پیڑ کے تیور بدلنے لگتے ہیں
کہیں جو گھاس کا تنکا بھی سر نکالتا ہے
پھر اس کے بعد ہی دیتا ہے کام کی اُجرت
ہمارے خون سے پہلے وہ زر نکالتا ہے
وظیفہ تجھ کو بتاتا ہوں ایک چاہت کا
جو قصرِ ذات سے نفرت کا شر نکالتا ہے
کہانی لکھتا ہے ایسے کہ اُس کا ہر کردار
نکلنا کوئی نہ چاہے ، مگر نکالتا ہے
میں ایسے شخص سے ارشد گریز کیسے کروں
فصیلِ دل میں جو دستک سے در نکالتا ہے

کہیں پڑھا تھا کہ ایک مرتبہ خلیفہ ہارون الرشید کے دربار میں ایک ماہر نشانہ باز نے باریاب ہو کر اپنے فن کے اظہار کی اجازت چاہی۔خلیفہ کی اجازت کے بعد اُس نے اہل دربار کے سامنے کپڑے سینے والی ایک سوئی زمین میں گاڑ دی اور پھر چند میٹر کے فاصلے پر کھڑے ہو کر ایک دوسری سوئی زمین میں گڑی ہوئی سوئی کی طرف پھینکی، جو پہلی سوئی کے ناکے میں جا کر ٹھہر گئی۔ مہارت کے ثبوت کے طور پر اُس نے اپنا یہ عمل تین چار مرتبہ دہرایا اور ایک مرتبہ بھی اُس کا نشانہ خطا نہیں ہوا۔اہل دربار اس

مہارت پر عش عش کر اُٹھے۔ خلیفہ نے حکم دیا کہ اس شخص کو ایک اشرفی انعام میں دی جائے اور ساتھ ہی دس کوڑے بھی اس کی پشت پر رسید کیے جائیں۔ وہ شخص پریشان ہوا، اہل دربار بھی حیرت زدہ رہ گئے۔ کیوں کہ دس کوڑوں والی بات کسی کی سمجھ میں نہ آئی۔ چناں چہ ہارون الرشید گویا ہوا اور اُس نے ایک تاریخ ساز بات کہی کہ ایک اشرفی نشانہ باز کی مہارت کے اعتراف میں دی گئی ہے اور دس کوڑے سزا کے طور پر اس لیے لگوائے گئے ہیں کہ اسے احساس ہو کہ اس نے اپنی عمر کا بہت سا قیمتی وقت ایک بے فائدہ اور بے مصرف کام میں صرف کر دیا۔

تاریخ ادب کے ایک بڑے غزل گو شاعر جگر مراد آبادی نے فنِ شاعری سے متعلق مقدمہ فانیؔ بدایونی میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ اپنی جگہ، مگر یہ ایک لافانی حقیقت ہے کہ ایک عرصے تک روایت پرستی نے جدید سوچ کی راہیں مسدود کیے رکھی تھیں، مگر ارشد محمود ارشد کی غزل کے مطالعے سے ایک بار پھر میرا یہ یقین پختہ ہوا ہے کہ روایت پرستی کے علم بردار اب زیادہ دیر غزل کے میدان میں ٹھہرتے دکھائی نہیں دیتے۔ اب وہی اس میدان میں آگے بڑھیں گے کہ جو نئے تجربوں کی روشنی میں غزل کے گیسوؤں کو پھر سے آراستہ کریں گے۔ ارشد نے تشبیہات، اصطلاحات، استعارات، لفظیات الغرض اُسلوبِ بیاں اور فکریات کے حوالے سے کہیں بھی روایت سے استفادہ نہیں کیا۔ یہ سلسلہ فراقؔ۔ احمد مشتاق اور ناصر کاظمی نے شروع کیا تھا اور جدید عہد میں اسے آگے بڑھانے، شعر کو گل و بلبل کے سحر سے آزادی دلانے والوں میں معاصر تخلیق کار بھی شامل ہیں۔ جن میں ایک نام ارشد محمود ارشد کا بھی ہے جو لفظ و معانی کے نئے نئے پیکر تراشنا چاہتے ہیں۔ اس لیے غزل کو مضامینِ نو سے آشنا کرنے کی تگ و دو کر رہے ہیں۔ زیرِ نظر غزل، اُردو کی اُسی غزل کا نیا روپ ہے جو اسے تخلیق کار کے عصری تجربات و مشاہدات نے فراہم کیا ہے۔ کلام میں ربط ہے، لفظوں میں اختراع تو نہیں مگر آج کی تازہ کاری ہے، فرسودگی نہیں۔ کلام میں صفائی ہے کہ ابلاغ اپنے تمام حسن کے ساتھ جلوہ ریز ہے، کلام میں دردمندی کا جوہر بھی ہے اور اظہار میں سلیقہ شعاری بھی۔ شاعری سائنس کی تجربہ گاہ نہیں ہے۔ کہ ایک ہی فارمولے سے نتائج سامنے آئیں یہ تو احساسات ہیں جو الفاظ کا جامہ پہن کر شعر کا روپ دھار لیتے ہیں۔

دوسری بات قافیہ اور ردیف کی بندش عمدہ ہے۔ دونوں اپنا مفہوم کامیابی سے ادا کر رہے ہیں۔ ابلاغ قابلِ ستائش ہے۔ غیر ضروری، مہمل اور بے سرو پا ترکیبوں سے دامن بچایا ہے۔ نظر جدید فکر پر رکھی ہے۔ اور فکر، سادگی، روانی، سلاست، صفائی سے قاری کو متاثر کیا ہے۔ انہوں نے اپنے کلام میں میرؔ و غالب کا ذکر کر کے کوئی رعایت نہیں لی۔ نہ قاری کو متاثر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُن کا اپنا لب و لہجہ ہے جو اُس خطے (سرگودھا) کا مجموعی رجحان بھی کہہ سکتے ہیں۔ کہ جس سے اُن کا خمیر اُٹھا ہے۔ اُن کا کلام، اُن کی شخصیت کا پرتو ہے۔ فکر رواں دواں اور جاوداں ہے، جمود کا شکار نہیں۔ زیرِ نظر غزل میں

مجھے اُن ہی کے خطے کے ایک شاعر افضل گوہر کا اُسلوب بیاں بھی جھلکتا محسوس ہوتا ہے۔ وہی سادگی، روانی اور صفائی۔ وہی اصطلاحات میں رچی ہوئی اپنی مٹی خوشبو۔ وہی موضوعات میں داخلیت اور خارجیت کا سلجھا ہوا توازن۔ استعارے اینٹی غزل کے نہیں۔ اپنی مٹی سے کشید کیے ہیں۔ زمیں کی کوکھ ، شجر ، پرندے ، شبِ سیاہ ، جگنو ، بوڑھا شجر ، گھاس کا تنکا ، قصرِ ذات ، فصیلِ دل وغیرہ۔ البتہ موضوعی غزل میں خوش فکری زیادہ ہے یعنی نفی سے اثبات کشید کیا گیا ہے جو ارشد کے مزاج کا حصہ بھی ہو سکتا ہے یا پھر اسی غزل کا اشثنائی جوہر بھی۔ کیوں کہ افضل گوہر کے ہاں خوش طبعی کی جگہ کشیدہ حالات وواقعات کی تلخی نمایاں ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمایے :

زمیں نے اونچا اُٹھایا ہوا ہے ورنہ دوست
ہم ایسے گھاس کے تنکے کہاں بڑے ہوئے ہیں
(افضل گوہر)

منظر اُجڑ گیا ہے مرے آس پاس کا
تنکا ہی لہلہائے کہیں سبز گھاس کا
(افضل گوہر)

غزل میں کہیں انتشار نہیں۔ فکر مربوط ہے، ہر شعر ایک اکائی ہے، غزل کا مجموعی تاثر یقین، خوش فکری ، محبت سے عبارت ہے۔ غزل کا مطلع دیکھ لیجیے یا چھٹا شعر ربِ دو جہاں کا قادرِ مطلق ہونا ظاہر ہو رہا۔ مطلعے میں اگر وہ رحیم وکریم محسوس ہو رہا ہے کہ پرندوں کے پر آنے سے پہلے ہی پودوں کو تناور درخت بنا دیتا ہے تو چھٹے شعر میں اس بات کا تیقن ہے کہ دنیا بے ثبات ہے، وہ جب چاہے زندگی کی کہانی میں سے کوئی کردار نکال دے۔ ایقان ہے ، کہیں تشکیک کا شائبہ تک نہیں جو کئی تخلیق کاروں کے نزدیک فیشن بن چکی ہے۔ پہلے دوسرے اور پانچویں شعر کو ملاحظہ کیجیے۔ شاعر نے کمال مہارت سے خوش فکری پیدا کی ہے اور یہ اُسی ایقان کا نتیجہ ہے جس کا میں نے ذکر کیا ہے۔ ارشد اُن شعرا میں سے ہے جو زلزلے کے بعد اک مکاں بھی سلامت دیکھ کر زمین وزماں کے تسلسل پر ایمان رکھتے ہیں۔ گھنگھور گھٹاؤں میں بجلیوں کی چمک بھی جن کو اُمید کی روشنی معلوم ہوتی ہے ۔ تخلیق کار کا کسی تحریک بہ شمول ترقی پسندی سے منسلک ہونا ضروری نہیں۔ کیا یہ ناکافی ہے کہ شاعر بھی اپنی ذاتی زندگی میں اپنے گرد وپیش رونما ہونے والے حالات وواقعات کا سامنا کرتا ہے۔ چوتھا شعر پڑھیے اور داد دیجئے کہ کس عمدہ انداز میں سرمایہ دارانہ نظام پر شاعر نے طنز کی ہے۔ شاعر کا مسلک محبت ہوتا ہے۔ وہ جو تخلیق کرتا ہے اس کے پس پردہ یہی جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ محبت ہی زمین وزمان کی بقا اور وجود کی ضمانت ہے۔ پانچواں اور آخری شعر مثال کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔ ہماری بدنصیبی ہے کہ ہم تخلیق کار آج اُن اخلاقی بیماریوں میں مبتلا ہیں جن کا ذکر ایک صدی پہلے حالی کر چکے ہیں۔ ایک

دوسرے کی صلاحیت کا اعتراف نہ کرنا، حسد میں مبتلا رہنا عام سی بات ہے۔ اپنے سے کم عمر شاعر کو بہتر لکھ رہا ہو تو اُس کی حوصلہ شکنی کرنا۔ اُس کی ترقی کے راستے مسدود کرنا۔ بوڑھے پیڑ اور گھاس کے تنکے کی علامتیں استعمال کر کے ارشد نے نہایت عمدہ شعر کہا ہے۔

میں مانتا ہوں کہ ایسی غزلیات میں رمز وایمائیت،

اور عاشقانہ جذبات ایسی خوبیاں کم کم دکھائی دیتی ہیں۔ جس سے ناقدینِ فن کو یہ اعتراض اُٹھانے کا موقع ملتا ہے کہ تغزل غزل سے مشتق ہے اور غزل تغزل سے عاری ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ہر فن ارتقا کا سفر کرتا ہے اور راستے کے خوب صورت مناظر کی اقدار دائمی ہوتی ہیں۔ نظریات کو بھی کئی تغیر پذیریوں کا سامنا رہتا ہے۔ اس لیے دیکھنا اور پرکھنا ہو گا کہ ہمارے عہد کی غزل کیا ہے۔؟ میرا عہد، قرونِ اولیٰ کی غزل یا اساتذہِ فن کا زیادہ منت کش نہیں ہے۔ اور یہ بھی دیکھنا ہو گا کہ قطب مشتری کے اشعار میں فنی معیارات کا تعین کرنے والا ملا وجہی یا نکات الشعرا میں اکیس مقامات پر فنی اور فکری خوبیوں کا اظہار کرنے والے میر تقی میر کے تنقیدی افکار آج کے پس منظر میں کتنے رائج الوقت ہیں۔؟ بہر حال ارشد محمود ارشد ایک عمدہ شاعر ہیں اور اُن کی یہ غزل بھی متاثر کن ہے اور سراہے جانے کے لائق ہے۔ وہ شاعری کے افادی پہلو پر یقین رکھنے والوں میں سے ہیں۔ صحت مندانہ خیالات رکھتے ہیں، انہیں اپنی شاعرانہ ذمے داریوں کا کامل شعور ہے۔ آج کلیم الدین احمد ہوتے تو ہم بڑے فخر کے ساتھ اپنے عہد کی غزل اُن کے سامنے رکھتے۔ یہی رجحان ہمیں نئی نسل کے اکثر شعراء کے ہاں دکھائی دیتا ہے جو ارشد محمود ارشد کے ہاں نظر آ رہا ہے۔ یہ الگ بات کہ کسی کے ہاں تغزل بھرپور ہے، کسی کے ہاں علامت و استعارہ حاوی ہے اور کسی نے عصری حسیت کو زیادہ اہمیت دی ہے کہ یہ رجحان مابعد جدیدیت ہی کی کڑی ہے۔

ایک درخشندہ ستارہ ۔۔ ارشد محمود ارشد

ذوالفقار احسن۔۔مدیر،،اسالیب،،سرگودھا

ادبی افق پر رنگ و نور کی کئی کہکشائیں دکھائی دے رہی ہیں۔ جنھوں نے آسمان ادب پر کتنے ہی خوش رنگ اور خوشنما ستارے بکھیر دیئے ہیں۔اور جن کی روشنی سے پورا اگگن جگمگا اٹھا ہے۔انہیں کہکشاؤں کا ایک درخشندہ ستارہ ارشد محمود ارشد ہے جس نے انتہائی قلیل عرصہ میں اپنی روشنی سے ایسے ہالے بنائے ہیں کہ ایک علیحدہ کہکشاں بنتی نظر آرہی ہے۔

ارشد محمود ارشد کی شاعری میں داخلیت اور خارجیت کی دونوں حوالوں سے بھرپور عکاسی نظر آتی ہے ۔ارشد نے وارداتِ قلبی کو کچھ اس طرح شعروں کے قالب میں ڈھالا ہے کہ ہر پڑھنے والا دل گرفتہ ہوا چلا جاتا ہے ان کی شاعری میں بلاشبہ رومان بدرجہ اتم موجود ہے مگر ارشد عام نوجوانوں کی طرح محض رومان ہی نہیں بلکہ زندگی کے تلخ روئیوں کی بات بھی کرتا دکھائی دیتا ہے۔ارشد محمود ارشد کی شاعری میں محبوب سے بے تکلفی کا جو انداز ملا ہے وہ انتہائی ریاضت کا متقاضی ہوا کرتا ہے۔ارشد کے ہاں کسی کے بچھڑ جانے کا کرب،بھی جا بجا ملتا ہے تصور کے کینوس پر جب کوئی چہرہ ابھرتا ہے تو ارشد فرط جذبات میں پلکوں پر چمکتے ہوئے جگنو سے محسوس کرنے لگتا ہے۔

ارشد محمود ارشد کا اولین شعری مجموعہ،،عجب سی بے قراری ہے،،نے بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔ ظفر اقبال جیسے معروف غزل گو نے فلیپ لکھ کر ارشد محمود ارشد کو زبردست خراج تحسین پیش کیا۔اب ارشد کا دوسرا شعری مجموعہ،،کبھی میں یاد آؤں تو۔۔۔،،منصۂ شہود پر آ گیا ہے تازہ شعری مجموعہ کو پڑھ کر اندازہ ہوا ہے کہ ارشد کا ارتقائی سفر رکا نہیں بلکہ تیزی سے آگے بڑھا ہے۔اس نے غزل کے فنی محاسن کو نہ صرف سمجھا بلکہ انہیں خوش اسلوبی سے نبھایا بھی ہے۔ارشد کی تازہ غزلوں میں جدید رنگ بھی نمایاں ہو کر سامنے آیا ہے۔ارشد کے مشاہدات و تجربات اس کی شاعری میں بھی نظر آتے ہیں۔اس کا دکھ،اس کی محرومی صرف اسی کی نہیں بلکہ انفرادی سطح سے اوپر اٹھ کر اجتماعیت کی شکل اختیار کرتی ہوئی نظر آتی ہے اور یہی وہ چیز ہے جو ارشد کو دیگر نوجوان شعرا سے نہ صرف ممتاز بلکہ منفرد کرتی ہے۔

سجی ہر شے دکانوں میں بھلی لگتی تو ہے لیکن
تمناؤں کے سکوں سے خریداری نہیں ہوتی

ارشد محمود ارشد کی شاعری کی عمارت رنگ، خوشبو، ہوا اور پرندہ ایسے مضبوط استعارے پر کھڑی نظر آتی ہے۔،، ہوا، اُن کے ہاں ایسا استعارہ ہے جو کبھی موت کا اعلامیہ اور کبھی زندگی کی رمق کے طور پر برتا گیا ہے۔ ارشد کا کمال یہ بھی ہے کہ اس نے ایک ہی لفظ کو مختلف معنوں میں برتا ہے جس سے شعر کی معنوی سطح بہت بلند ہوتی نظر آتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کس طرح سے اب کروں میں ساحلوں کی آرزو
ہے شکستہ بادباں بھی اور ہَوا کوئی نہیں

بجھا رہی ہے اگر وہ تو پھر بتاؤ مجھے
کبھی چراغ بھی جلتا ہے کیا ہَوا کے بغیر

ایک اور شعر ملاحظہ ہو:

خیالِ یار کی چلتی رہی ہَوا ، ارشد
تو ٹمٹماتا رہا دل کا بھی دیا ارشد

ارشد کا نیا شعری مجموعہ ،، کبھی میں یاد آؤں تو۔۔۔،، ایک ایسا مہکتا ہوا گلاب ہے جس کی خوشبو سے دبستان سرگودھا بڑی دیر تک مہکتا رہے گا

خوابوں کا شاعر

عابدہ شاہ۔۔ برطانیہ

مجھے ارشد محمود ارشد کے پہلے مجموعہ ،، عجب سی بے قراری ہے ،، کو پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ میں نے اُس میں ایک ایسے شاعر کی جھلک دیکھی ہے جو اکیسویں صدی میں بھی معجزوں کا منتظر ہے۔ وہ خواب دیکھتا ہے اور ان کی تعبیر کے لیے مضطرب بھی رہتا ہے۔ لیکن جب خواب ٹوٹتے ہیں تو وہ حوصلہ نہیں ہارتا بلکہ اپنے ٹوٹے ہوئے خوابوں کی کرچیوں سے شعروں کی ایسی مالا پروتا ہے جسے کوئی بھی حساس دل انسان سراہے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ارشد کی شاعری چونکہ سادہ اور عام فہم ہونے کے ساتھ ساتھ جذبات واحساسات سے لبریز بھی ہے اسی لیے قاری کے دل کی دھڑکنوں کے ساتھ جلد ربط پیدا کر لیتی ہے یہی وجہ ہے کہ ارشد کے اکثر مصرعے قاری کو اپنے دل کی صدا محسوس ہوتے ہیں۔اب جب کہ ارشد کا دوسرا شعری مجموعہ ،، کبھی میں یاد آؤں تو۔۔۔، منظر عام پر آرہا ہے تو میں تہ دل سے اس کی کامیابی کے لیے دعا گو ہوں۔اللہ کرے کہ ارشد کامیابیوں کے سفر پر یونہی گامزن رہے۔آمین

کبھی میں یاد آؤں تو

فوزیہ مغل۔۔۔لاہور

سرگودھا فنون لطیفہ کے حوالے سے بہت ذرخیز مقام ہے جس پر اللہ کی خصوصی عنایت رہی ہے اور جاری ہے جہاں ڈاکٹر وزیر آغا ، شکیب جلالی ، جیسی قدآور شخصیات نے جنم لیا۔ارشد محمود ارشد کا تعلق بھی اسی ادب پرور فضا سے ہے۔ غائب کے مضامین پہلے تخلیق کار کے خیال کے کینوس پر اپنا عکس ڈالتے ہیں جسے تخلیق کار سلیقہ ، ہنر مندی سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کرتا ہے۔ارشد محمود ارشد کے خیالوں کا کینوس بھی بے حد وسیع ہے جس میں قدیم روایات کی جھلک جدید رنگ میں ملتی ہے جس سے ارشد محمود کے کلام میں منفرد و بھرپور تاثر ابھرتا ہے۔ارشد محمود ،، عجب سی بے قراری ہے ،، کے بعد ،، کبھی میں یاد آؤں تو۔۔۔،، کی صورت میں اپنے من مندر میں بجتی گھنٹیوں کو شبدوں میں ڈھالنے میں کامیاب ہوگیا۔ میری دعا ہے کہ زندگی کے ہر موڑ پر کامیابیاں ارشد محمود ارشد کا مقدر بنیں۔

،،بساطِ زیست،، کا شاعر

قمر چوہدری

ہمعصر معاشرہ بظاہر ترقی پذیر ہے لیکن فرد کو امان حاصل نہیں، ماحول بدل رہا ہے لیکن بدلتا ہوا ماحول اچھائیوں کے بجائے برائیوں کو زیادہ تر جنم دے رہا ہے ذہنی، جسمانی، روحانی، عائلی، انفرادی، معاشرتی، معاشی اقدار کی تقریباً مکمل شکست وریخت ہو چکی ہے ایسے میں ایسے نوجوان شاعر کا جنم ہی قابلِ رشک ہے جہاں واقعات و حالات شاعر کا سوچنے والا ذہن اور دھڑکنے والا دل ان واردات کو اپنی ذات کے حوالے سے شناخت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ایک دانشور، مفکر، مقنن، مفسر سے گھبرا گھبرا کر سوال کرتا ہے۔ ارشد محمود ارشد جذبات کی پیکر تراشی کرنے والے شاعر ہیں۔ ان کے اسلوب میں روایتی شاعری کی مٹھاس اور لہجے میں تروتازگی اور فکر و خیال کی بے شمار نیرنگیاں موجود ہیں چاہے وہ حمد و نعت ہو یا غزل ہو عہدِ حاضر میں کوئی عظیم شاعر خواہ پیدا نہ ہوا ہو لیکن ایسے شعراء کی تعداد خاصی نظر آتی ہے جن کو اچھا اور منفرد کہا جا سکے جیسا کہ کچھ اشعار دیکھیے :

خودی کے زعم میں ایسا وہ مبتلا ہوا ہے
جو آدمی بھی نہیں تھا وہ اب خدا ہوا ہے

اسی کے ہاتھ پہ بیعت میں کر کے آیا ہوں
جو بوڑھا پیڑ کڑی دھوپ میں کھڑا ہوا ہے

خراج مانگتا ہے مجھ سے یہ بدن میرا
کہ لوحِ دل پہ ترا نام بھی لکھا ہوا ہے

عہدِ رواں میں ارشد محمود ارشد کسی بھی تعارف کا محتاج نہیں ہے ان کی شاعری میں اداسی اور سناٹے کا یہ احساس انفعالیت کا زائیدہ نہیں بلکہ حقیقتوں کے جمال کی حیثیت رکھتا ہے ارشد محمود ارشد فنِ غزل کے جملہ لوازمات اور باریکیوں سے کما حقہ واقف ہیں ان کی روح و قلب کی گہرائیوں سے ادب کے گہرے دریا کی شناوری کرتے ہوئے غزل کا پاس و لحاظ اور عبد و معبود کا فرق ملحوظ رکھ کر ہوش و خرد کے ساتھ اس گہرے دریا سے ایسے ایسے گوہر ہائے آب دار چُنے ہیں جو یہاں کم ہی دیکھنے کو ملتے ہیں ان کی زبان و قلم شائستہ، ذہن و فکر پاکیزہ، جذبہ و تخیل اعلیٰ اور افکار و رجحانات میں طہارت ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام کی زیریں رو میں افراط و تفریط اور کذب آمیز مبالغہ آرائی کو کہیں بھی جگہ نہیں مل سکی ۔ عمر کے اس آئینہ خانے میں کتنی ہی تصویریں ہیں جنہیں ہاتھ لگائیں تو ہتھیلیوں پر مقدر کی لکیریں

پھیکی پڑ جائیں ہونٹ چھولیں تو پیاس کے صحیفے اتریں۔ عجیب ہے قصہ شب و روز بھی کبھی تدبیر کی حیرانی، کبھی تکمیل کی جولانی، کبھی فتح مندی کا غرور کبھی شکست سے چور چور گمان و یقین ہم رقص نظر آتے ہیں۔

میرا کردار چیخ اُٹھتا ہے
ہونٹ جب بھی سیوں کہانی میں

مداری بس تماشا کر رہا تھا
مگر بچہ جمورا مر رہا تھا
وہ جو فٹ پاتھ پر اوندھا پڑا ہے
کبھی اس شخص کا بھی گھر رہا تھا

زمیں کی تشنگی دیکھی نہیں گئی مجھ سے
میں اپنی اوک میں دریا اٹھا کے لایا ہوں
یہ پیاس علم کی کچھ تو بجھایئے صاحب
بڑے جتن سے میں بستہ اٹھا کے لایا ہوں

ارشد محمود ارشد کی شاعری میں کناروں کے درمیان بہتے ہوئے دریا کی لہروں کا اطمینان اور سرشاری ہے ایک زخم خوردہ آگاہی اک خوشگوار سادگی اک انا پرست سپردگی دریا جو سیلاب کرتا ہے

اس بھری بھری زمین پہ دریا کو زعم تھا
صحرا کے پاس آیا تو رستہ بدل گیا

ارشد محمود ارشد اپنی پوری شاعری میں نہ مرصع کار نظر آتا ہے اور نہ ہی وہ کسی سستی رومانویت کا اظہار کرتا ہے ایک سنجیدہ اور کسی حد تک فکری لب ولہجہ اس کی شاعری پر حاوی ہے جیسا کہ یہ سب کیا ہے ارشد محمود ارشد کی غزلوں میں چند استعارے تواتر کے ساتھ آتے ہیں انہیں استعاروں میں انفرادی تجربے کو ایک حسی پیکر بنا دیتے ہیں اور کبھی تجربے کی انفرادیت کے تجدیدی تعینات کی

دیواریں گراکرانھیں شخصی یاذاتی استعاروں کواجتماعی وعمرانی تجربوں کے اظہاروابلاغ کاواسطہ بنالیتے ہیں

نادانی میں دشمن سے مل بیٹھے ہیں
یاروں پر تلوار اٹھانا ٹھیک نہیں
کیسی چاہت ارشد فانی دنیا کی
سر پہ یوں سنسار اٹھانا ٹھیک نہیں

سرسبز لفظیات، شاداب شعری لغت اور شگفتہ اسلوب ان کی غزلوں کی خصوصیات ہیں خاک جواناکا مظہر ہے عشق جوانکسار کا جوہر ہے سو خاک اور عشق ایک ہی وجود میں یکجا ہو گئے توانا وانکسار بھی ہم معنی قرار پائیں گے انہی اضداد کی بابت میں نے کہا کہ ارشد محمود ارشد کی شاعری میں ایک ہی کل کے اجزاد کھائی دیتے ہیں بساطِ زیست میں موجود چند ایک غزلوں کی ورق گردانی کرنے پر جو کچھ لکھ سکا میں نہیں سمجھتا کہ ارشد محمود ارشد کے فن کو مکمل طور پر ٹٹول دیا ہے میں نے۔ میری دعا ہے کہ ارشد محمود ارشد کو رب کل جہاں مزید کامرانیوں سے ہمکنار کریں۔ یہ ادب کا ایک سرمایہ ہیں جو شائد ہماری خوش بختی ہے کہ ہمارے عہد میں جنمے گئے ہیں سلامتی کی قلبی دعائیں ارشد محمود ارشد کے لیے مولا سلامت وشاداب رکھے۔

کبھی میں یاد آؤں تو۔۔

انوار فیروز

''کبھی میں یاد آؤں تو۔۔،، سرگودھا کے نوجوان شاعر ارشد محمود ارشد کا دوسرا شعری مجموعہ ہے اس سے قبل ان کا ایک مجموعہ ،، عجب سی بے قراری ہے ،، شائع ہو کر مقبول عام کا درجہ حاصل کر چکا ہے۔
اس مجموعے میں روایت کے ساتھ ساتھ جدید لہجہ اور ہمارے معاشرے کے حالات کی تصویر بھی ہے ۔ارشد محمود ارشد جوان ہیں اور اس عمر میں رومانی شاعری تو لازمی ہوتی ہے لیکن انہوں نے موجودہ عہد کے ظلم و جبر اور گھٹن کے خلاف بھی توانا آواز بلند کی ہے مثلاً:

جہاں پر کوڑیوں کے مول میں انصاف بکتا ہے
وہاں مظلوم کو اکثر عدالت مار دیتی ہے

ظلم و جبر کے خلاف آواز بلند کرنے کے لیے اس نے کربلا کا استعارہ استعمال کیا ہے۔ارشد محمود ارشد کی شاعری فنی ارتقاء کی طرف مسلسل گامزن ہے یقیناً وہ شاعری کے میدان میں قطبی ستارہ بن کر ابھرے گا۔،، کبھی میں یاد آؤں تو۔۔۔ میں غزلوں کے علاوہ نظمیں بھی ہیں۔ارشد محمود ارشد کی شاعری توانا ہے اور بات کرنے کا اپنا لہجہ ہے۔
یہ کتاب اردو شاعری میں خوبصورت اضافہ ہے۔اس کی شاعری کو ڈاکٹر سید شبیہ الحسن ، باقی احمد پوری، ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم، شفیق آصف، عابدہ شاہ اور فوزیہ مغل نے اپنی تحریروں میں سراہا ہے

کبھی میں یاد آؤں تو۔۔۔

عالیہ بخاری ہالہ۔لاہور

جس طرح بہار میں پھوٹنے والی تازہ کونپلیں آنے والے تپتے موسموں کے لیے ٹھنڈک کی نوید بن کر آتی ہیں۔اسی طرح ہمارے نئے لکھنے والے نئی نئی سوچوں،امیدوں اور جذبوں کی تازگی لیے اس بات کے پیامبر ہوتے ہیں کہ آنے والی کل کو سنبھالنے والے ہاتھ اتنے مضبوط اور توانا ہیں کہ وہ آنے والے وقت کی مہار اپنے ہاتھوں میں رکھ سکیں۔اور سرپٹ بھاگتے وقت کے گھوڑے کو اپنی مرضی کا رخ دے سکیں۔کہ اس بات سے تو انکار کیا ہی نہیں جا سکتا کہ کسی بھی معاشرے کو بنانے سنوارنے یا بگاڑنے میں لکھنے والوں کا ایک مضبوط کردار ہوتا ہے۔

''کبھی میں یاد آؤں تو۔۔۔''،نوجوان شاعر ارشد محمود ارشد کا شعری مجموعہ ہے۔ارشد محمود ارشد سرگودھا سے تعلق رکھنے والے ایک اولوالعزم اور ابھرتے ہوئے شاعر ہیں۔اور اس سے پہلے ان کا ایک اور شعری مجموعہ،،عجب سی بے قراری ہے،،کے نام سے منصۂ شہود پر آ چکا ہے۔

اس خوبصورت کتاب کے فلیپس ڈاکٹر سید شبیہ الحسن اور فوزیہ مغل نے لکھے ہیں۔اور مضامین میں باقی احمد پوری،پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم،شفیق آصف،ذوالفقار احسن اور عابدہ شاہ نے ارشد کے فنِ شاعری پر روشنی ڈالی ہے۔

کتاب کا ٹائٹل خوبصورت ہے۔اس جملے سے ہو سکتا ہے کہ ہمارا نوجوان شاعر غلط فہمی میں مبتلا ہو جائے کہ (کیونکہ اس نے ٹائٹل پر اپنی تصویر دے رکھی ہے) لیکن بہر حال ٹائٹل خوبصورت ہے اور ہم ڈوبتے ہوئے شام کے سورج کے بجائے ابھرتی ہوئی صبح کا سورج تصور کریں تو یہ ایک امید افزا صورت حال کا پیامبر ہو سکتا ہے۔مگر کتاب کا نام اور اس پر دی گئی نظم اداسی کا تاثر لیے ہوئے ہے۔

زیر نظر کتاب میں ستر کے قریب نظمیں،غزلیں شامل ہیں۔ارشد محمود ارشد کی غزل نہ صرف اپنے عہد کی نمائندگی کرتی ہے بلکہ اس نے اپنی غزل میں غزل کے روایتی پن کو بھی برقرار رکھا ہے۔یہ اشعار دیکھئے

کیوں یہ ہونے لگا یقیں صاحب
میرا دل بھی مرا نہیں صاحب
دل کے آنگن سے تو نکل بھی گیا
پھر بھی رہتا ہے تو یہیں صاحب

اس کے اشعار میں جدائیوں کا گہرا کرب بھی ہے اور نارسائیوں کا دکھ بھی۔ بلکہ اگر بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو پوری کتاب مایوسی، جدائی اور نارسائی کے کہر میں لپٹی ہوئی نظر آتی ہے اور شاید یہ مایوسوں اور نارسائیوں کے دھندلکے دور حاضر کے انسان کا المیہ ہیں۔ یہاں ہر شخص ہی غم جاناں اور غم روزگار کے ساتھ ایک روحانی مایوسی اور محرومی کے دکھ میں مبتلا نظر آتا ہے۔ جدید دور کی آسائشوں، اشیاء، خوبصورتی اور تفریح کی بھرمار نے انسان کو محرومی کے ایسے کرب میں مبتلا کر دیا ہے جو اسے کوہ ندا کے اندھے غاروں کی طرف کھینچے لیے چلی جاتی ہے۔ اس دور کے انسان کا المیہ ہی یہی ہے کہ وہ صبر، شکر اور صدق جیسی صفات سے محروم ہو گیا ہے، وہ بہت کچھ پا کر بھی تشنہ کام رہتا ہے اور کہہ اٹھتا ہے کہ

سجی ہر شے دکانوں میں بھلی لگتی تو ہے لیکن
تمناؤں کے سکوں سے خریداری نہیں ہوتی

اور کبھی کہتا ہے

رات کی چادر پہ جیسے تیرگی بکھری ہوئی
حسرتوں کی سیج پر ہے زندگی بکھری ہوئی

دور موجود کی بے اطمینانیوں، روحانی اداسیوں اور بے چین نارسائیوں کا ایک عکس دیکھیے

تو ہی پیاس بجھا دے تو تو دریا ہے
میرے چاروں جانب تو اک صحرا ہے

کسی شاعر یا ادیب کا قلم اپنے دور کا عکاس ہوتا ہے۔ سوارشد محمود ارشد کے قلم کا انعکاس دیکھیے

عجب سوچوں میں دل اٹکا ہوا ہے
کہ میرِ کارواں بھٹکا ہوا ہے
کوئی انہونی شاید اب کے ہو گی
درِ دل پر جو اب کھٹکا ہوا ہے

نجانے کیا تماشا ہو رہا ہے
جو بونا تھا وہ اونچا ہو رہا ہے

جھلسا دیئے ہیں اس طرح صحرا کی دھوپ نے
چہرے مسافروں کے ہیں کالے پڑے ہوئے

عشق، ہجر و وصال، رومانویت کے بغیر شاعری اور خصوصاً غزل کا تصور ناممکن ہے اور یہ جذبے ارشد کی شاعری میں بھی عروج پر نظر آتے ہیں۔ اور پڑھنے والے کے قلب و ذہن پر اثر پذیر ہوتے ہیں۔ اور یہی ایک شاعر کا کمال فن ہے۔ نمونہ دیکھیے

عشق کا آزار ہے اور کچھ نہیں
بس خیالِ یار ہے اور کچھ نہیں

موسم تھا بے مثال تمھیں سوچتے رہے
اوڑھے تھے غم کی شال تمھیں سوچتے رہے
دیکھا تھا کل جو باغ میں پھولوں کا رنگ و روپ
اے حسنِ بے مثال تمھیں سوچتے رہے

وہ پہلی پیار کی بارش کا تذکرہ کر کے
تجھے اداس ہی کرنا تھا خود بھی رونا تھا

سرگودھا فنون لطیفہ کے حوالے سے بہت زرخیز مقام ہے۔ اس خطے نے بڑی بڑی شخصیات کو جنم دیا ہے۔ ارشد محمود ارشد کا تعلق بھی اسی ادب پرور فضا سے ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آنے والے وقتوں میں وہ بھی ایک روشن ستارہ بن کر چمکیں گے۔ اور آنے والے وقتوں کی مہار ان کے توانا ہاتھوں میں ہو گی۔

عجب سی بے قراری ہے

ڈاکٹر محمد مشرف حسین انجم

اس بات سے دل میں مسرت کے گلہائے رنگارنگ کھل اٹھتے ہیں کہ سرگودھا،،دبستانِ ادب،،کے نام سے معروف ہو چکا ہے۔ سچے اور سُچے جذبوں کے ساتھ ساتھ صداقت کی رعنائیوں سے مزین شعراء و ادباء یہاں پر دن رات تخلیقات کے پھولوں کی خوبصورت لڑیاں پرونے میں مصروف و منہمک ہیں۔اور یہ انہماک ان کی روح کے محل میں موجود اس لافانی سوز و گداز کی وجہ سے ہے جو کسی بھی بلند پایہ خیالات کی حامل شخصیت کا حصہ ہوتا ہے یا اس کی ذات کے ساتھ بڑی خوبصورتی اور دلکشائی کے ساتھ جڑا ہوا ہوتا ہے۔ ضلع سرگودھا کے شعراء و ادباء کی تخلیقی کاوشیں اپنے مفاہیم و معانی کے اعتبار سے انفرادیت کا تاج زریں پہنے ہوئے ہوتی ہیں۔اور اس تاج میں جڑے ہوئے نگینوں کی چمک دمک آرٹیفشل نہیں ہوتی بلکہ ان نگینوں کی تابناکی دیکھ کر ہیروں کا تصور ذہن میں ابھر آتا ہے۔ ،،عجب سی بے قراری ہے،،سرگودھا کے آکاش ادب پر مندرجہ بالا خوبیوں کی روشنی کے ساتھ نمودار ہونے والا ایک شعری مجموعہ ہے جس میں ارشد محمود ارشد کے کلام کی ایک کہکشاں آباد ہے۔ہر شعر ان کے سچے اور کھرے جذبات کا آئینہ دار ہے۔ محبت کے خمیر میں گندھا ہوا ہر شعر ان کے قلب و ذہن میں محبت کی اس لافانی خوشبو کا عکاس ہے جو قدرت کی طرف سے کسی کسی کو عطا ہوتی ہے۔ محبت اور پیار کی اس آب جو میں جھانکنے سے مشرقی اقدار و روایات کی پاسداری کے ساتھ ساتھ بامقصد اور حقیقت پسندی پر مشتمل بحریں بھی سامنے آئی ہیں جس سے ان کے ذہن کی پاکیزگی اور خوبصورتی منعکس ہوئی ہے۔ مثلاً

زباں سے جو نکل کر بھی فلک تک جا نہیں سکتیں
وہ مدت تک خلاؤں میں دعائیں رقص کرتی ہیں
کچھ ایسے بھی تو ظالم ہیں جو کلیوں کو مسلتے ہیں
مگر پھر ان کے دل میں بھی سزائیں رقص کرتی ہیں
ہوا سورج اگر گم ، تو اندھیرا کیسے جائے گا
کہ سارے شہر پر کالی گھٹائیں رقص کرتی ہیں

منزل قسمت والوں کو ملتی ہے۔ کبھی کبھی منزل سامنے ہو کر بھی نصیبوں کے درخشندہ ستارے گم ہو جاتے ہیں۔ بہت خوبصورت انداز کے ساتھ اس بات کی عکاسی اس شعر کے انگ انگ سے ہو رہی ہے۔

یقیں تھا سامنے ہے یہ میں جا پہنچوں گا منزل تک
گماں کب تھا مقدر کا ستارہ کھو بھی سکتا ہے

ارشد محمود ارشد کے تخلیق کردہ اشعار نے میرا دل موہ لیا ہے اور ان اشعار نے مجھے بڑی رعنائی کے ساتھ اپنی طرف خود بخود کھینچا ہے۔

روپ کا سورج بھی آخر ایک دن ڈھل جائے گا
جس جوانی پہ ہیں نازاں بے وفا ہو جائے گی
تند لہروں سے وہ آخر کب تلک بچ پائے گا
ریت کا جو گھر بناتا ہوں تمہاری یاد میں

جس طرح موت ایک اٹل حقیقت ہے ہر انسان نے اس کا ذائقہ چکھنا ہے،، کل نفسٍ ذائقۃ الموت،، اسی طرح عزت اور شہرت کے لیے مشکلات کی وادی پر خار سے گزرنا بھی ضروری ہے اور ایک اٹل حقیقت ہے یہ اشعار اسی حقیقت کی روشنی قرطاس پر کچھ اس انداز کے ساتھ پھیلا رہے ہیں۔

مکمل زندگانی کا سفر آخر تو ہونا ہے
کسی دن موت کی آغوش میں سر رکھ کے سونا ہے
حدودِ زندگانی سے نکل جاؤں گا میں اک دن
کہ اس دنیائے فانی سے نکل جاؤں گا میں اک دن
آخری وقت آ جائے تو پھر کبھی موت ٹلتی نہیں
سامنے ہی نظر آئے گی وہ کھڑی جس طرف جاؤ گے
مشکلیں جھیل کر راہِ پُرخار پر تم جو چلتے رہے
عزتیں ، شہرتیں پھر ملیں گی بڑی ، جس طرف جاؤ گے

پیڑ، پودے ، یہ خوبصورت رعنائیوں سے بھرے بھرے اشجار اس ارض کی خوشنمائی و دلربائی کو بڑھانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں اگر یہ نہ ہوں تو سائے کے لیے ہر جاندار ترسنے لگتا ہے اور دھوپ اس پر اپنی چادر تان لیتی ہے۔ ارشد محمود ارشد کے یہ اشعار اسی حساس موضوع پر بڑی مضبوط گرفت کے ساتھ غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔

لہلہاتے ہوئے پیڑ پودے اگر تم جلاتے رہے
ہر طرف دھوپ ہی پھر ملے گی کڑی جس طرف جاؤ گے

آسمانوں سے برستی ہی رہے گی آگ پھر
لہلہاتے پیڑ پودے جو گرائے جائیں گے
ہاں جھلسنے لگے گا تمہارا بدن وقت کی دھوپ میں
اپنے ہاتھوں سے جو تم نے کاٹا شجر ، بھول نہ پاؤ گے

ارشد محمود ارشد کو تیرگی سے نفرت ہے وہ اس جہاں میں موجود تیرگی کو ختم کرنے کا حل اپنے اس شعر میں جس خوبصورتی اور دلیری کے ساتھ بیان کرتے ہیں وہ کچھ یوں ہے۔

تیرگی کا راج ٹوٹے گا یقیناً اس طرح
خونِ دل سے جب چراغِ شب جلائے جائیں گے

زندگی میں کامرانی اور فوز و فلاح سے ہمکنار ہونے کے لیے انسان کا حقیقت پسند ہونا بے حد ضروری ہے۔ جو شخص اس جہان آب و گل کا باسی ہے اور وہ حقیقت پسندی سے دور ہے وہ یقیناً زوال پذیر ہے۔ ارشد محمود ارشد کی حقیقت پسندی ان اشعار سے خوب خوب عیاں ہے۔

خوف سیلابِ بلا کا پھر رہے گا ہر گھڑی
ساحلوں کی ریت سے جو گھر بنائے جائیں گے
کسی صندل کی لکڑی سے محل تعمیر تو ہو گا
مگر پھر آگ میں اک دن جلایا جائے گا آخر
یہی مٹی کہ جس مٹی سے تو بچ بچ کے چلتا ہے
اسی مٹی میں کل تجھ کو دبایا جائے گا آخر

ارشد محمود ارشد نوخیز شاعر ہونے کے باوجود گہری سوچ کے مالک ہیں وہ ہر بات کی تہ تک پہنچنے کے عمل سے واقف ہیں۔ حقیقتوں سے نظریں چرانا ان کی فطرت میں شامل نہیں ہے۔ یا یوں کہیے کہ حقیقت پسندی ان کی نس نس میں بسی ہوئی ہے خالی جذبات کی دنیا میں بسنے والے اشخاص ایسے اشعار تخلیق نہیں کیا کرتے۔

کبھی بہتا ہوا پانی نہ ٹھہرا ہے نہ ٹھہرے گا
کبھی یہ وقت کا دھارا نہ بدلا ہے نہ بدلے گا
جو شاخیں خشک ہو جائیں تو ان پر گُل نہیں کھلتے
جو راہِ زندگانی میں بچھڑ جائیں نہیں ملتے

،،عجب سی بے قراری ہے،، ایک خوبصورت اور بامقصد مجموعہ کلام ہے۔ اس کے صفحات پر پھولوں کی طرح بکھری شاعری کو صرف ،، رومانوی شاعری،، سمجھنا میرے خیال کے مطابق شاعر کے ساتھ

زیادتی کے مترادف ہے۔ارشد محمود ارشد کو صرف رومانیت کا شاعر قرار دینا بھی قرین انصاف نہیں ہے۔کیونکہ اگر غور سے ان کی شاعری کے اس مجموعے کا مطالعہ کیا جائے تو بیشتر اشعار مقصدیت اور حقیقت پسندی کے لبادے میں لپٹے ہوئے ہیں۔اور جنہیں پڑھنے کے بعد نگاہ ان کے مفاہیم و معانی میں اٹک جاتی ہے۔ارشد محمود ارشد ایک باعمل اچھے انسان بھی ہیں وہ بے عملی کی دلدلوں سے دور بھاگتے ہیں۔جب ان کی سوچ اپنے عمل پر کھتی ہے تو یہ اشعار خود بخود ان کے ذہن سے ان کے قلم کی نوک تک آجاتے ہیں۔

میں کیا منہ لے جاؤں گا خدا کے سامنے ارشد
عمل دیکھوں میں اپنے جب اداسی گھیر لیتی ہے

سب موسم قدرت کے تخلیق کردہ ہیں اس لیے ہر موسم سے محبت یقیناً خدا سے محبت ہے ارشد محمود ارشد کا یہ شعر اس موضوع کی مناسبت سے کس قدر دلنشیں اور معتبر ہے۔

تجھ کو پیار کا موسم ہی کیوں بھاتا ہے
مجھ کو سارے موسم اچھے لگتے ہیں

ارشد محمود ارشد دعا کی اہمیت سے واقف ہیں انہیں معلوم ہے کہ اللہ رب العزت سنتا ہے وہ دعاؤں کو ضائع نہیں کرتا۔

دعا جو بھی مانگو گے مالک سنے گا
مگر آنسوؤں سے وضو لازمی ہے
دل سے نکلی تو رائیگاں نہ گئی
جو بھی مانگی دعا وضو کر کے

یقیناً ایسے اشعار ایک بے نمازی تخلیق نہیں کرسکتا۔ایسے اشعار وہ شخص تخلیق کر سکتا ہے جو نماز اور وضو کی دنیا کا باشندہ ہے اور وضو کے بعد مانگی ہوئی دعا کتنی پُرتاثیر ہوتی ہے اس کا عکاس یہ شعر ہے۔

خشک شاخوں پہ ثمر آ جائے گا
جب دعاؤں میں اثر آ جائے گا

،،عجب سی بے قراری ہے،، 160 صفحات پر مشتمل ہے بہترین کاغذ پر طبع ہوئی ہے۔غزلیات اور نظمیں ہر قرطاس پر یوں موجود ہیں جیسے کسی گلشن میں پھول کھلے ہوئے ہوں۔ابتدا حمد و نعت کی بہاروں سے ہوئی ہے۔اس سے ارشد محمود ارشد کے باطن کی خوبصورتی سامنے آئی ہے۔ادب رنگ پبلی کیشنز ملتان کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والی یہ کتاب حسن کا شاہکار ہے اس کے صفحات پر

پھولوں کی طرح بکھرے کئی اقسام کے بامقصد اشعار آسانی سے تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ یہ اشعار تبصرہ نگار کیسے نظر انداز کر سکتا ہے۔

تاریخ یہ گواہ ہے پسِ اعتبار بھی
نوچے گئے ہیں کس طرح سے عزتوں کے پھول
کہا اس نے اجالوں کی تمنا کیوں نہیں کرتے
کہا میں نے صبح کے بعد آخر شام ہوتی ہے

لڑتا تو رہا بادِ مخالف سے مگر پھر
حالات کے طوفان سے ہارا یہ پرندہ
کہا میں نے کہ رنگ و نسل میں تقسیم ہے دنیا
کہا اس نے محبت کی بھلا کیا ذات ہوتی ہے
کہا اس نے تری بستی کیوں ملیامیٹ لگتی ہے
کہا میں نے ہوئی تھی دوستی جو زلزلوں کے ساتھ
کہا اس نے خدا کے سامنے کیوں سر جھکایا ہے
کہا میں نے جیوں گا اس طرح سے عظمتوں کے ساتھ

لگن ہے جو ارشد تو پھر ڈھونڈ لو گے
ملے گا خدا ، جستجو لازمی ہے

،،شام کی دہلیز پر،،

غزالہ تبسم:

شاعر نے جس رنگ سے اپنا تعارف کرایا ہے اس سے ہم مرعوب بھی ہوئے اور محظوظ بھی، مرعوب یوں کہ سرگودھا ایسے شہر کا مردم خیز خطہ کہ جس کی مٹی سے جنم لیا ڈاکٹر وزیر آغا، شکیب جلالی، غلام جیلانی اصغر، ارشد ملک، شاکر کنڈان، ذوالفقار احسن، عاشر وکیل راؤ اور اب ارشد محمود ارشد۔

اور محظوظ یوں کہ شاعر کا حرفِ آغاز میں اپنا جملہ ،،یہ میری اُسی اداسی کا تسلسل ہے جو کہ 2007 میں ،،عجب سی بے قراری ہے،، اور پھر 2009 میں ،،کبھی میں یاد آؤں تو۔۔۔،، کی صورت میں ادبی افق پر نمودار ہوئی اور اب 2014 کے آغاز میں مجھے ،،شام کی دہلیز پر،، لے آئی ہے، بہت خوب۔

بے شک شاعر اگر شاعری کی گھٹی پی کر پلا بڑھا ہے تو اُسے اپنے حسب نسب پر فخر زیب دیتا ہے خاندانی نہ سہی خطہ کی مٹی، روایات خود پتا دیتی ہیں کہ موصوف کے پنگھوڑے کو کس نے ہلایا ہے، مگر اس کے باوجود آخری کسوٹی خود شاعر کا اپنا تخلیقی جوہر ہے۔

ارشد محمود ارشد کا تیسرا مجموعہ ،،شام کی دہلیز پر،، ہمیں چکھنے کے لیے بھیجا گیا۔ خوب و مرغوب ہے، کہیں کہیں ذائقہ کلام تازہ، کہیں کہیں آنچ قدرے تیز لگی، شعروں کی دروبست درست ہے۔ استعارے چاق و چوبند، مصرعے روایت سے کلام مربوط، مگر روایتی پن سے ہٹ کر مخاطب زیادہ تر اجنبی مگر اجنبیت کی دیوار کو گرنے نہیں دیا۔ استعارے اجنبی، رہگزار، ہمسفر اجنبی، گھر اجنبی، شجر اجنبی، نظر اجنبی،

دور منزل کہیں، راہگزر اجنبی
اُس پہ یہ بھی ستم ہمسفر اجنبی
جب سے ماں کو لحد میں اُتارا گیا
تب سے لگنے لگا مجھ کو گھر اجنبی

اور پھر بیچ میں اساتذہ کے رنگِ سخن کی جھلک دکھائی دیتی ہے، کیا خوب شعر ہے

جب تری یاد کا اس دل میں شرارہ ناچے
صبح کی آنکھ ہنسے شام کا تارا ناچے
اب جو کم ہونے لگی دل کی اُداسی ارشد

اس سے کہو کہ وہ اک بار دوبارہ ناچے

اور یاد کیجیے اس شعر کو

دھمالیں اس لیے بھی ڈالتا ہوں
کہیں کھویا ہوا ہے یار مجھ میں

دشمنی کے علاج کو دو بول پیار کی دوا تجویز کرتے ہیں

زباں ہو تلخ تو یوں رنجشیں پنپتی ہیں
دو بول پیار کے برسوں کی دشمنی کا علاج

جابجا کلام اپنے عہد سے کلام کرتا نظر آتا ہے اور اب ہمارا ظالم زمانہ ایک اور رنگ سے اپنا اظہار کرتا نظر آتا ہے۔

کسی نے سچ کہا تھا یہ زمانہ ایک تھیٹر ہے
یہاں سب پیٹ کی خاطر بچارے رقص کرتے ہیں

اب آخر میں ذرا زمانے کا یہ رنگ بھی دیکھیے کہ شہر و ملک ایک خوف کی فضا میں سانس لے رہے ہیں

اُمیدوں کے گلستاں میں خزائیں رقص کرتی ہیں
بدل جائے گا یہ موسم زرا تم حوصلہ رکھنا

گردشِ ماہ وسال

عالیہ بخاری ہالہ۔لاہور

ماہ و سال تو مجھے یاد نہیں لیکن سوچوں تو مجھے کافی پرانی بات لگتی ہے الحمراء میں ایک کتاب کی تقریب پزیرائی تھی مجھے یاد نہیں ہے کہ وہ تقریب کس تنظیم نے منعقد کرائی تھی لیکن ماہنامہ نوازش کی مدیرہ اور موء قر جریدۓ تجدید نو،، جو مشفق و مہربان دوست محترمہ عذرا اصغر اور بہت پیاری دوست شبہ طراز کی زیر ادارت شائع ہوتا تھا کی مشاورت میں شامل تھی اس لئے مجھے اس تقریب میں خصوصی طور پر دعوت دی گئی تھی کیونکہ کتاب لکھنے والا شاعر نوازش اور تجدید نو فیملی کا باقاعدہ ممبر تھا نو عمو اور کیوٹ سے شاعر نے مجھے خاصا متاثر کیا نو عمری میں ہی قدرت اس پر کس قدر مہربان تھی اس کی شاعری اللہ پاک کے خاص کرم کی آئینہ دار تھی تقریب کے اختتام پر محترم بھائی شاکر کنڈان میرے پاس تشریف لائے اور بولے آپی مجھے آپ سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا انسانوں کے اس جنگل میں جہاں کوئی کسی کو بہن بھائی تو کیا انسان ماننے کے لئے بھی تیار نہیں اگر کسی چہرے پر احترام اور آنکھوں میں حیا نظر آئے تو دل اللہ پاک کا بہت ممنون ہوتا ہے سچ مچ لگتا ہے جیسے کوئی ماں جایا ہی ہے شاکر بھائی کے ساتھ صاحب تقریب بھی تھا آپی مجھے بھی آپ سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا بے حد شرماتے ہوئے اس نے کہا اس کے بعد جب تک نوازش چھپتا رہا ہمارا مستقل رابطہ رہا نوازش کے بعد اس ٹوٹے ہوئے رابطے کو فیس بک نے بحال کیا نومبر میں موصول ہونے والی تیسری کتاب اسی شاعر ہونہار وزی وقار ارشد محمود ارشد کی کتاب بساط زیست ہے لیکن کتاب پر بات کرنے سے پہلے میں بتانا پسند کروں گی کہ اتفاقیہ طور پر ہماری ادبی تنظیم پاکستان ادب ورثہ لاھور کا ایک پروگرام سرگودھا میں ہونا قرار پایا میرے لیے وہ شاہینوں کی سرزمین تو ہے مگر وہ میرے قلمی بھائیوں کا شہر بھی ہے دل میں موہوم سا خیال تھا کے شاید ملاقات ہو جائے اور ملاقات ہو بھی گئی مقام حیرت یہ تھا کہ وہ نوجوان جو مجھے ماضی میں ملا تھا اس کے ہمعصر وقت کی سیڑھیاں چڑھتے کافی دور آن پہنچے تھے مگر وہ وہیں نوجوانی کی اولیں منزل پر کھڑا مسکرا رہا تھا شرما رہا تھا

تو جناب یہ تو تھا صاحب کتاب کا ذکر خیر اب کتاب کی باری آتی ہے "عجب سی بے قراری ہے" سے شروع ہونے والا سلسلہ "کبھی میں یاد آؤں تو۔۔۔،، اور "شام کی دہلیز پر" کے بعد "بساط زیست" تک آن پہنچا ہے۔ بساط زیست شاعر کے خیال کی پختگی اور فنی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے اپنے بارے میں بات کرتے ہوئے وہ کہتا ہے

"میں اس ریگزار کا تنہا مسافر نہیں مگر خود کو قافلے سے باہر محسوس کرتا ہوں"
وہ بے قراری اور یہ تنہائی کا احساس ہی ایک شاعر کا سب سے بڑا روحانی ورثہ ہے یہ وہ مقام ہے جہاں قدرت انسان کو کرب کے ایک گہرے احساس کے ساتھ اظہار ذات کا حوصلہ عطا کر دیتی ہے خدا خود شاعر کے اندر ظہور پزیر ہو کر تبلیغ فرماتا ہے اور ناخواندہ روح بے اختیار پکار اٹھتی ہے

وظیفہ تجھ کو بتاتا ہوں ایک چاہت کا
جو قصر ذات سے نفرت کا شر نکالتا ہے

نجانے کون سی جنت کی جستجو ہے تجھے
کہ جس کے واسطے جینا مرا حرام ہوا

اور پھر یہ کیفیت بھی دیکھیے

یہ میرا دین یہ مذہب غرور ہے ارشد
عمل یہ دیکھ کے اپنے میں شرمسار بھی ہوں

لبادہ اوڑھ کے رکھتا ہوں میں روایت کا
خیالِ دشت کا اک شتر بے مہار بھی ہوں

کیا آپ میرے ساتھ اتفاق نہیں کرتے کہ اتنا سچ وہی روح بول سکتی ہے جسے حق عطا کر دیا جائے .
کتاب کے بارے میں نامور ادیبوں اور شاعروں نے مضامین لکھے ہیں ٹائٹل تجریدیت کا عمدہ شہکار ہے ۔کتاب میں مضامین ، نعت رسول مقبول اور سلام کے علاوہ قریباً 104 غزلیں اور دس نظمیں شامل ہیں مجموعی طور پر یہ کتاب دیدہ زیب اور دلکش معیار کی حامل ہے اور بے شک ارشد کی شاعری قاری کے دل میں اتر جانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

عجب سی بے قراری ہے

عالیہ بخاری ہالہ۔لاہور

شاعری کسی شاعر کے دل میں چھپے ان خوبصورت جذبوں کے اظہار کا نام ہے جو لفظوں کے روپ میں آکر بہت سے حساس اور گداز دلوں کی آواز بن جاتے ہیں۔ کسی نئے شاعر کی آمد مایوس فضاؤں میں اک نئے سورج کی طرح امیدوں، خواہشوں اور خوابوں کی تکمیل کا عزم لیے ہوئے ہوتی ہے۔ارشد محمود ارشد بھی ایک ایسے ہی شاعر ہیں جن کی آمد آسمان ادب پر ایک نئے اجالے کا سبب بن سکتی ہے۔چند دن پہلے میں نے ارشد محمود ارشد کو محترمہ عذرا اصغر کے پاس بیٹھے دیکھا تو مجھے ایسے ہی لگا جیسے کوئی طالب علم کلاس چھوڑ کر اپنے آدرش کی تکمیل کا عزم لیے راہ ادب کے کٹھن راستوں کا مسافر بن گیا ہے۔ موصوف کا کہنا ہے کہ آپ کم سنی سے لکھ رہے ہیں لیکن سچ یہ ہے کہ کم سنی اور معصومیت ابھی تک اپنے پورے وقار کے ساتھ ان کے چہرے پر موجود ہے۔کتاب کھولنے سے پیشتر مجھے امید نہیں تھی کہ ،،عجب سی بے قراری ہے،، کا مطالعہ کرتے ہوئے میری ملاقات ایک پختہ کار شاعر سے ہوگی۔ ارشد محمود ارشد محبت کے شاعر ہیں اور اپنی واردت قلب اور جذباتی اتار چڑھاؤ کے اظہار کے فن سے آگاہ بھی۔اپنی شاعری میں انہوں نے نہ صرف انسان کے ذاتی دکھ کو موضوع بنایا ہے بلکہ اپنی مشرقی روایات کا پاس بھی رکھا ہے۔ ارشد محمود ارشد کے اکثر اشعار چونکا دینے والے ہیں، جیسے

کچھ بھی پایا نہ آرزو کر کے
کھو گیا ہوں میں جستجو کر کے
خود تماشا کہیں نہ بن جاؤ
میری رسوائی کو بکو کر کے
جو شاخیں خشک ہو جائیں تو ان پر گُل نہیں کھلتے
جو راہ زندگانی میں بچھڑ جائیں نہیں ملتے
یقیں تھا سامنے ہے یہ میں جا پہنچوں گا منزل تک
گماں کب تھا مقدر کا ستارہ کھو بھی سکتا ہے

شاکر کنڈان ان کے بارے کہتے ہیں کہ جو لوگ ارشد محمود سے ملے ہیں یا جنہیں ان سے واسطہ ہے وہ اس حقیقت سے اچھی طرح باخبر ہیں کہ انہوں نے ہمیشہ وقت سے پہلے اپنا کام نمٹانے کی کوشش کی ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ ان کا یہ بیان ان کے بارے میں میرے جو احساسات تھے ان کی تائید کرتا ہے۔ بہر حال ارشد محمود صاحب ہم آپ کو گلستان ادب میں خوش آمدید کہتے ہیں۔اور ہماری نیک تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

،،کبھی میں یاد آؤں تو۔۔۔،،

آفتاب خان۔۔لاہور

سرگودھا کی سرزمین سے تعلق رکھنے والے نوجوان شاعر ارشد محمود ارشد کا شمار عصر حاضر کے ان شعراء میں کیا جا سکتا ہے جن سے مستقبل میں اردو شاعری کی بہت سی اُمیدیں وابستہ ہیں۔اُن کے دوسرے شعری مجموعے،،کبھی میں یاد آؤں تو۔۔،،کا مطالعہ کر کے احساس ہوتا ہے کہ ارشد محمود بڑی سنجیدگی کے ساتھ شعروادب سے وابستہ ہے اور وہ شاعری کو عارضی ذمہ داری کی بجائے کل وقتی ذمہ داری سمجھ کر سرانجام دے رہا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس کے بیشتر اشعار نہ صرف دل کو چھوتے ہیں بلکہ اُن میں تازگی اور سلاست بھی پائی جاتی ہے۔پھر مضامین میں بھی رنگارنگی کی جھلک موجود ہے اور یہ سب چیزیں مل کر اسے اپنے ہم عصر شعراء کی صف اوّل میں کھڑا کرنے کے لیے کافی ہیں۔ اُس کی شاعری میں تنوع اور ندرت پائی جاتی ہے۔وہ دلنشیں انداز میں دل کی بات کرتا ہے ذراچند اشعار دیکھیے۔

بہت ہے وہ حسین ارشد پہ اس کے ہاتھ ٹھنڈے ہیں
سنا ہے ایسے لوگوں میں وفاداری نہیں ہوتی
نمٹ لوں گا میں ارشد دشمنوں سے
ابھی احباب سے الجھا ہوا ہوں
اس تیرگی کے راج کو توڑیں تو کس طرح
اس سوچ میں ہیں کب سے اُجالے پڑے ہوئے
بدن تو ٹوٹ رہا تھا مگر انا تھی ابھی
تمہارے در سے پلٹ آئے ہم صدا کے بغیر

ارشد محمود ارشد کی شاعری کا بنیادی استعارہ تو محبت ہی ہے۔مگر وہ اپنے ارد گرد کے ماحول سے بے خبر نہیں،ماضی بھی اُس کے ذہن کے دریچوں میں دیے کی طرح روشن ہے اور حال بھی اس کی آنکھوں کی پتلیوں میں تیر رہا ہے۔اس طرح اگر وہ ایک طرف کربلا کو اپنے شعروں کا حصہ بناتا ہے تو دوسری جانب عصر حاضر کے یزید بھی اس کے قلم کی دسترس میں ہیں۔اس تناظر میں اُس کے یہ اشعار دیکھئے۔

تذکرہ کوئی کرے جس پل تمہارا کربلا
خون کے آنسو بہائے دل ہمارا کربلا

خدا نے انساں کو رتبہ دیا مگر اس نے
بنا دیئے ہیں ہر اک شے سے معتبر پتھر
تعجب کیا کسی مفلس نے گر ہے خودکشی کر لی
کہ زرداروں کو بھی تو اُن کی دولت مار دیتی ہے

ارشد محمود کے اس شعری ذخیرے میں جا بجا اچھے اور عمدہ اشعار موجود ہیں ان کا انتخاب گرچہ مشکل ہے لیکن میں کچھ شعر ضرور آپ کے ساتھ شئیر کرنا چاہتا ہوں۔یہ اشعار پڑھ کر آپ کو ارشد محمود کی شاعری کو باریک بینی سے پرکھنے کا موقع میسر آئے گا اور انہیں پڑھ کر آپ ضرور یہ تمنا بھی کریں گے کہ اس طرح کے باقی اشعار پڑھنے کے لیے ارشد محمود کا شعری مجموعہ خریدا جائے۔ لہٰذا آپ یہ اشعار پڑھیں اور اپنے فیصلے پر عملدرآمد کریں۔

مری دھرتی کیا بنجر ہو گئی ہے
کہ ہر منہ سے نوالہ جا رہا ہے
موسم تھا بے مثال تمہیں سوچتے رہے
اوڑھے تھے غم کی شال تمہیں سوچتے رہے
وہ کیا بھلا مٹائے گا تشنہ لبی مری
چاہت کی ایک بوند جو دیتا نہیں کبھی
ٹھٹھرتی رات میں جب کوئی سائباں نہ ملا
تمہاری یاد کو خود پر لحاف کرنا پڑا
کیوں تمنا کر رہے ہو اس سے تم بُو باس کی
پیڑ شیشم کا کبھی کافور ہو سکتا نہیں
کیا خبر کوئی تھکا ہارا مسافر آ رکے
اس لیے میں کر رہا ہوں باغبانی ریت پر

،، کبھی میں یاد آؤں تو ــــ ،،

ثمینہ گلؔ۔۔ سرگودھا

ادب کے آسماں پر جب بھی کوئی گھٹا برسی اور اس کے فن کی قوس قزح مجموعے کی شکل میں آئی تو رنگوں کی بہار میں اہل ذوق رنگین ہو جاتے ہیں۔ ارشد محمود ارشد ادب کے افق پر جب غزلوں، نظموں کی قوس قزح لیے وارد ہوئے تو ایک ،، عجب سی بے قراری ہے ،، اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے تھے۔ جس میں خوشبو، تتلی، بادل، یاس و امید اور تنہائی کے موسم کی ساری باتیں تھیں۔ مگر اس میں دل کا سکون لٹ جانے کا احساس انھیں یہ گانے پر مجبور کر رہا تھا

یہی برسات کا موسم کبھی جو دل لبھاتا تھا
مجھے اب کیوں نہیں بھاتا عجب سی بے قراری ہے
لگاؤ دام چاہت کے تو یہ بھی ذہن میں رکھنا
ہر اک شے ہی زمانے میں تو بازاری نہیں ہوتی

یہاں پر ارشد محمود ارشد نے قافیے کی خوبصورت کوہ پیمائی کی ہے۔ سنی سنائی باتوں میں حقیقت تلاش کرنے کی کوشش بھی کی اور انھیں پرکھ کر ترازو پر تولتے ہوئے وفاداری کے لیے گرم ہاتھوں کا ہونا لازمی قرار دیا۔ انھوں نے اپنے لفظوں کی حرارت سے زمانے کی سرد مہری اور رگوں میں جمے ہوئے لہو کو گرم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور یہ بھی بتایا کہ تمناؤں کے سکوں سے ہر چیز کو خرید نہیں سکتے۔

سجی ہر شے دکانوں میں بھلی لگتی تو ہے لیکن
تمناؤں کے سکوں سے خریداری نہیں ہوتی
بہت ہے وہ حسیں ارشد پہ اس کے ہاتھ ٹھنڈے ہیں
سنا ہے ایسے لوگوں میں وفاداری نہیں ہوتی

ارشد محمود ارشد کی نوک قلم سے ندرت، جدت، سلاست اور شائستگی کے پھول جا بجا کھلتے نظر آتے ہیں۔ ان کی سوچ کی زمین زرخیز ہے۔ مشق سخن کی تپتی دھوپ میں جل کر جب بھی جس نے بھی کہا ہو گا اچھا ہی کہا ہو گا۔ ارشد محمود کچھ اس طرح کہتے ہیں۔

نہر ، دریا ، اور سمندر کا یہ پانی ریت پر
لکھ رہا ہے ایک مدت سے کہانی ریت پر

اس غزل میں انھوں نے ریت کی زمین میں نہایت خوبصورت پھول اگائے ہیں۔اور انھوں نے معاشرے کی ناہمواری کی عکاسی بھی کی ہے۔اور زمانے کی بے راہ روی کا شکوہ بھی کیا ہے۔اس میں ہمت ، حوصلہ اور انسانیت سے پیار کا وہ سچا جذبہ چھپا نظر آتا ہے۔اگر خلوص نیت کے ساتھ محنت کی جائے تو ریگزاروں میں بھی گلستاں کھل اٹھتے ہیں۔

کیا خبر کوئی تھکا ہارا مسافر آ رکے
اس لیے میں کر رہا ہوں باغبانی ریت پر

یہ غزل انسانیت کی معراج کو سمجھتے ہوئے انسانوں سے پیار و محبت کا درس دیتی ہے۔وہ ریت پر باغبانی کر کے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اگر لگن ہو تو فرہاد کی طرح چٹانوں سے دودھ کی نہر پھوٹ پڑے اور ریت میں بھی سایہ دار درخت اگ آئیں۔

،،کبھی میں یاد آؤں تو۔۔۔ کا شاعر،،

ناصر عباس ناصر

جب میڈیا نے ترقی نہیں کی تھی۔ دنیائے ادب میں خدائے سخن میر تقی میر، انیس، دبیر، مرزا غالب ،بہادر شاہ ظفر، سودا، مومن، حافظ، داغ دہلوی، ودیگر ناموراور بزرگ شعراء کے دور میں مشاعرے انتہائی عروج پر ہوا کرتے تھے۔ دور دراز، گرد و نواح اور مختلف علاقوں کے شعراء مہینے میں متعدد مرتبہ مختلف مقامات پر ادبی نشستوں اور مشاعروں کا انعقاد کر کے اپنا تازہ کلام پیش کرتے، دادِ تحسین، خراج تحسین کے ساتھ ایک دوسرے کے کلام پر تنقید، تبادلہ خیال کو اپنی اصلاح کے زمرے میں سنتے اور محسوس کرتے تھے۔ محفلوں کا سلسلہ پوری پوری رات جاری رہتا۔ گو کہ اکثر شعراء شراب نوشی کے گرویدہ ہوا کرتے تھے مگر وہ عمدہ معیاری اور رموز شاعری کے مطابق شعر کہنے اور سننے کے بہت زیادہ قائل تھے۔ طرحی مصرعہ کی تعریف یہ ہے کہ کسی اچھے شاعر کی کہی ہوئی غزل یا نظم میں سے ایک مصرعہ لے کر اسی وزن، بحر، ردیف، قافیہ کے مطابق ثانی مصرعے سے گرہ لگائی جاتی ہے اور پھر غزل یا نظم کی تکمیل ،،طرحی،، کہلاتی ہے۔ اس دور میں طرحی مشاعروں کو خاص اہمیت اور انفرادیت حاصل تھی شعراء مکمل پابندی کے ساتھ طبع آزمائی کرتے۔ معیاری کلام تخلیق کر کے معیاری شاعر ہونے کا ثبوت فراہم کرتے تھے۔ یعنی مشاعروں کو اجاگر کرنے، ذریعہ اظہار و خیال اور ایک درسگاہ کا رتبہ و مقام حاصل تھا۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بزرگ شعراء اپنی ادبی زندگی کی جمع پونجی کو جمع کر کے آخری ایام میں شعری مجموعے کی صورت میں دنیائے ادب کو ایک بے مثال تحفہ عطا کرتے جو آنے والے شعراء کے لیے نمونہ عمل اور مشعل راہ ثابت ہوتا۔

جوں جوں میڈیا نے ترقی کی منازل طے کرنا شروع کیں۔ مشاعروں کی اہمیت میں کمی کے اثرات نظر آنے لگے۔ یہ کہنا بھی غلط ہوگا کہ مشاعروں کا دور ختم ہو گیا ہے مشاعرے ہو رہے ہیں مگر ویسے نہیں جیسا کہ ہونے چاہیں تھے۔ اور کچھ قلم کار ایسے بھی ہیں جو پرانے شعراء کے سلسلے کو رواں رکھے ہوئے ہیں۔

شعراء کے اسی سلسلے کی ایک کڑی ارشد محمود ارشد ہے جنہوں نے اسی کتابی سلسلے کو، کبھی میں یاد آؤں تو۔۔۔، کی صورت میں نبھایا۔۔۔

ارشد محمود ارشد کا تعلق سرزمین سرگودھا سے ہے وہ یکم فروری 1975 کو پیدا ہوئے۔ چونکہ شاعر، ادیب، دانشور، فنکار، تخلیق کار پیدائشی ہوتا ہے اور وہ عمر کے کسی حصے میں بھی شاعر فنکار تخلیق

کارہونے کاثبوت فراہم کر سکتا ہے۔ارشد محمود ارشد کو اپنے اندر کے شاعر تخلیق کار نے اپنے ہونے کا احساس زمانہ طالب علمی میں ہی دلا دیا تھا تاہم ان کا پہلا اردو شعری مجموعہ 2007 میں ،، عجب سی بے قراری ہے ،، منصہ شہود پر آیا۔ جس نے خاصی پذیرائی حاصل کی۔

ارشد محمود ارشد سے میرا تعارف مختلف رسائل، جرائد اور اخبارات کے ذریعے ہوا چونکہ ناچیز راقم کو قلم قبیلے کا ایک ادنیٰ فرد ہونے کا اعزاز حاصل ہے ہم ایک دوسرے کا کلام پڑھتے تھے یوں ہم دونوں میں رابطوں کا سلسلہ بڑھنے لگا انہوں نے بے لوث محبت کا ثبوت ،، کبھی میں یاد آؤں تو۔۔۔،، ارسال کر کے دیا جو کہ ان کا حالیہ منصہ شہود پر آنے والا دوسرا اردو شعری مجموعہ ہے۔ خوبصورت نظموں اور غزلوں کے ساتھ ساتھ اس شعری مجموعہ میں شعری ادب کا تسلسل (باقی احمد پوری) کبھی میں یاد آؤں تو۔۔۔ پر ایک نظر (پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم)،ارشد محمود ارشد کی شاعری کا نقش ثانی (شفیق آصف) ایک درخشندہ ستارہ۔۔۔ارشد محمود ارشد (ذوالفقار احسن) ڈاکٹر شبیہ الحسن و دیگر قلمکاروں کی خوبصورت آرا اور تبصرے شامل ہیں۔جنہوں نے صاحب کتاب کو مستقبل کا نامور شاعر ،ادیب، دانشور ،اور منفرد تخلیق کار قرار دیا ہے۔اظہار تشکر کے طور پر ارشد محمود ارشد کا کہنا ہے کہ ،، عجب سی بے قراری ہے ،، کی اشاعت سے لے کر اب تک میرے کلام کو بہت پذیرائی ملی۔ دوستوں اور قارئین کے بے حد اصرار پر اپنا دوسرا شعری مجموعہ ،، کبھی میں یاد آؤں تو۔۔۔،، آپ کے سامنے پیش کر دیا ہے ۔ امید واثق ہے کہ محبتوں کے خزانے میں اضافہ ہو گا۔ بہر حال 128 صفحات پر مشتمل اس اردو شعری مجموعہ کو مغل پبلشنگ ہاؤس لاہور نے دیگر مجموعوں سے منفرد، دلفریب انداز و اہتمام سے شائع کیا ہے۔ انتساب صاحب کتاب نے اپنے بڑے بھائی حاجی محمد اسلم، محمد اشرف،اور محمد اصغر کے نام کیا ہے۔ سرورق پر صاحب کتاب کی تصویر کے ساتھ ساتھ کتاب کے نام کی مناسبت سے عمدہ خیالات سے مزین خوبصورت آزاد نظم بطریق احسن شائع کی گئی ہے۔ شعری مجموعہ ،، کبھی میں یاد آؤں تو۔۔۔،، میں موجود ارشد کا مختلف کلام صفحہ قرطاس پر قارئین کی نذر ہے

ہو عطا مجھ کو یہ دولت مالک ارض و سماء
دل میں ہو بس تیری چاہت مالک ارض و سماء

تاجدار حرم آپؐ کے نام پر میں سدا اپنی سانسیں لٹاتا رہوں
جب تلک سانس میری یوں چلتی رہے آپؐ کی نعتیں پڑھ کر سناتا رہوں

کونسا ہے معرکہ جس نے بچایا دین کو
انبیاء نے یک زباں ہو کر پکارا کربلا

تیری باتیں اور یادیں رات بھر لکھتا رہا

صبح دم تھی کاغذوں پر شاعری بکھری ہوئی
نمٹ لوں گا میں ارشد دشمنوں سے
ابھی احباب سے الجھا ہوا ہوں
اترا ہے آج کیا یہ سورج زمین پر
ہر شخص کو ہیں جان کے لالے پڑے ہوئے

ارشد محمود ارشد ایک نوجوان شاعر اور راہ ادب کے تازہ دم مسافر ہیں ان کے پاس زادِ سفر کے طور پر الفاظ کے ذخائر، رموز شاعری سے آشنائی اور خیالوں کی فراوانی سے ظاہر ہوتا ہے کہ مستقبل میں ان کا شمار صف اول کے شعراء میں ضرور ہو گا۔ اور جس طرح انہوں نے وفا، محبت، عشق، سچائی یا نفرت، بے وفائی، وعدہ خلافی وغیرہ جیسے سدا بہار موضوعات پر منفرد انداز میں طبع آزمائی کی ہے وہ قابل تحسین ہے۔ ان کے کلام میں حقیقت اور مجاز کو اپنے اپنے قوانین کے مطابق محسوس کیا جا سکتا ہے۔

محترم قارئین کرام! صاحب کتاب یا کتاب پر تبصرہ کر نا صرف تعریف کرنے کے زمرے میں نہیں ہونا چاہیے۔ تعریف کے ساتھ ساتھ تنقید بھی ضروری ہے۔ اس سے قلمکار کو آگے بڑھنے کی تحریک ملتی ہے۔ میرا اپنے دوست ارشد محمود ارشد کو ایک مشورہ ہے کہ وہ ان دو شعری مجموعوں کو منظر عام پر لا کر اپنے آپ کو کبھی مکمل شاعر تصور نہ کریں اور نہ ہی ان کو ادب کی منزل سمجھیں کیونکہ ادب کی کوئی منزل نہیں ہے ادبی راہوں پر مسلسل سفر کرنے کا نام ادب ہے۔ امید واثق ہے وہ اپنا ادبی سفر حسب روایت جاری و ساری رکھیں گے

آخر میں ارشد محمود ارشد کی خوبصورت غزل کے اشعار قارئین کے نام۔۔۔۔

پھول ، شبنم رنگ و بو میں رابطہ رکھا گیا
کس لیے کانٹوں کو ان سب سے جدا رکھا گیا
اس نے اپنی عظمتوں کو ریزہ ریزہ کر دیا
جس کے سر پہ تاجِ مخلوقِ خدا رکھا گیا
سو سہارے بانٹتا ہے اک سہارا چھین کر
کب کسی کو عمر بھر بے آسرا رکھا گیا
ایک دن ملنا تھا جس دھرتی میں خوں مظلوم کا
نام اس کا ہی ازل سے کربلا رکھا گیا

متفرق شعراء کے فلیپ

ظفر اقبال۔اوکاڑہ۔:۔ہمارے اطراف و جوانب شعری اظہار میں جو تبدیلیاں آرہی ہیں،، عجب سی بے قراری ہے،، کا شاعر بھی اس سے بیگانہ اور متاثر ہوئے بغیر کیونکر رہ سکتا ہے۔ شعر تو شعر ہے گرد و پیش کی ہر شے مسلسل تبدیل ہو رہی ہے جو ایک نئے شاعر کے لیے حیرت انگیز بھی ہے اور غیر معمولی بھی۔ ارشد کی شاعری کا بنیادی استعارہ محبت ہے اور یہی وہ اساسی موضوع ہے جس پر آج تک غزل کی پر شکوہ عمارت استوار نظر آتی ہے جبکہ محبت جیسی طاقتور شے خود شاعر کا اندر باہر بھی تبدیل کر کے ہی چھوڑتی ہے اور ابتدائی طور پر یہ شاعر کی درست سمتی کی بھی نشاندہی کرتی ہے لیکن فی زمانہ خالی خولی محبت ہی سے شاعر کا کام نہیں چل سکتا چنانچہ اس کے لیے ضروری ہے کہ محبت کے بیان میں کچھ اور چیزوں کی ملاوٹ کرے کیونکہ ایمانداری کی بات یہی ہے کہ سارا کاروبار ہی ملاوٹ کا ہے۔ اُمید کرنی چاہیے کہ یہ شاعر اپنی تازہ کاری کو نہ صرف قائم رکھے گا بلکہ اس میں خوش رنگ اضافے بھی کرے گا اور غزل جیسی اس مستقبل گیر صنف کا نام اپنی نظموں کے ساتھ ساتھ مزید روشن کرے گا میری طرف سے ڈھیر ساری دعائیں۔۔

سرفراز شاہد۔اسلام آباد۔:دبستانِ سرگودھا کے مقبول شاعر ارشد محمود ارشد ایک عرصے سے خیابانِ سخن کی آبیاری میں مصروف ہیں۔ اور اب ان کا پہلا مجموعہ کلام،، عجب سی بے قراری ہے،، منظر شہود پر آچکا ہے۔ اس کی اشاعت پر ہم انہیں دلی مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

ارشد کسی خاص ادبی گروہ یا لابی سے تعلق نہیں رکھتے اور نہ ہی کسی خاص سیاسی نظریہ کے حامی ہیں۔ وہ تو محبت کے شاعر ہیں۔ انسان دوست ہیں اور دم انسانیت کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری میں ہمیں ادبی معیار کی ایک باوقار فضا جابجا دکھائی دیتی ہے۔ دراصل انہوں نے انسان کے ذاتی دکھ اور کرب کو اشعار کے سانچے میں ڈھالا ہے دوسری نمایاں بات یہ ہے کہ انہیں اپنی مشرقی اقدار وروایات سے بے حد پیار ہے اور اس خوبی کی جھلکیاں بھی ان کے کلام میں اکثر دکھائی دیتی ہیں۔ الغرض ان کا کلام روایت اور جدیدیت کا ایک حسین امتزاج ہے اور ادب کے خزینے میں ایک خوشگوار اضافہ ہے۔

شاکر نظامی۔ شاعری ان لطیف جذبوں کا اظہار ہے جو کسی حساس انسان کے دل میں خوابیدہ ہوتے ہیں اور یہ جذبے جب اظہار کا روپ دھارتے ہیں تو ہر دل کی آواز بن جاتے ہیں ارشد محمود ارشد تازہ لہو کے اس قبیلے کا فرد ہے جن کی شاعری معاصر صورتحال سے ہم آہنگ ہے وہ ایک سچا اور محبت کرنے والا انسان ہے جو اپنے اشعار میں معاشرتی مدوجزر کے ساتھ ساتھ محبت اور وفا کے جذبوں کی ترجمانی بھی

کرتا ہے اس کے شعروں میں واردات قلبی اور سوز و گداز بھی وافر طور پر موجود ہے ارشد ابھی نوجوان ہے تاہم اس کا شعری سفر خوش آئند ہے اور اس کے شعری اُفق پر کئی منظر بھی طلوع ہوں گے
--

خالد اقبال۔ سرگودھا۔ ہر نئے شاعر کی نوا حقیقت میں اس دنیا کے لیے امید کا پیغام ہوتی ہے اور نئے امکانات کی جستجو کا عمل بھی۔ ارشد محمود ارشد کومل جذبوں کا شاعر ہے اس کی شاعری محض رومانی کیفیات کی آئینہ دار ہی نہیں بلکہ ان کی شاعری دکھ اور کرب کی اس لے سے بھی آشنا ہے جس کا تعلق موجودہ عہد کے منظر نامے سے ہے۔ میں ارشد محمود ارشد کو ان کے اولین شعری مجموعے کی اشاعت پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔۔

اسد اعوان۔ سرگودھا علم و ادب کے حوالے سے اپنا ایک الگ مقام رکھتا ہے۔ دنیائے ادب پہ سرگودھا کی زرخیز زمین سے اُبھرنے والے تخلیق کاروں کا راج رہا ہے ان تخلیق کاروں میں نوجوان غزل گو شاعر ارشد محمود ارشد کا اضافہ قابل داد و تحسین ہے۔ ارشد محمود ارشد نے قلیل عرصہ میں دنیائے علم وادب میں اپنی ایک الگ پہچان بنالی ہے۔،، عجب سی بے قراری ہے، ارشد کا اولین شعری مجموعہ ہے جس کے مطالعہ کے بعد قارئین، عشاق دل فگاراں کی مانند یادوں کی وادی میں بادیہ پیمائی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ارشد بنیادی طور پر غزل کا شاعر ہے مگر اس کی نظمیں بھی بھرپور تاثر رکھتی ہیں۔ ہر صاحبِ دل اپنے اندر بے قراری محسوس کرتا ہے۔ اس بے قراری کی مختلف وجوہات مثلاً: انتظار، ہجر و وصال، نشاط والم، عسرت و عذلت اور آئے دن رونما ہونے والے حادثات و واقعات ہیں۔ جب کسی بے قراری کا سبب معلوم نہ ہو سکے تو وہ،، عجب سی بے قراری ہے،، کا روپ دھار لیتی ہے۔ ارشد کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہوتا ہے کیونکہ بقول ارشد کے مجھے اپنی بے قراری کا سبب معلوم نہیں ہو رہا۔ اور میں اس کھوج میں ہوں کہ مجھے یہ بے قراری کیوں ہے؟ اس کے باوجود ارشد کسی طور بھی قنوطیت اور یاسیت میں کھوئے نظر نہیں آتے بلکہ رجائیت سے بھرپور ہیں۔ ارشد جس طرح سے ارتقائی منزلیں عبور کر رہا ہے وہ دن دور نہیں جب یہ نوجوان غزل گو دنیائے ادب پہ شمس النہار کی مانند رخشندہ نظر آئے گا۔ دعا گو ہوں: خالق ارض و سما ارشد کے علم میں اضافہ فرمائے۔ آمین

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن۔ ہمارے ناقدین کا المیہ یہ ہے وہ کسی نو آموز شاعر کے کلام کو پرکھنے کے لیے غالب اور میر کے معیار کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ غالب اور میر کی عظمت سے کوئی ذی ہوش انکار نہیں کر سکتا لیکن آج کا معاشرہ ان کے زمانوں سے یکسر مختلف ہے۔ انہیں سامع اور قاری دستیاب تھے لیکن آج کے شاعر کا المیہ یہ ہے کہ اسے قاری اور سامع دونوں میسر نہیں۔ اس صورت حال میں کسی نوجوان کا شعر و ادب سے تمسک رکھنا کسی جہاد سے کم نہیں اور مقامِ مسرت ہے کہ جناب ارشد محمود

ارشد اس علمی و ادبی جہاد میں صف اوّل کے قلمی سپاہی بن کر ہمارے سامنے آ رہے ہیں،، کبھی میں یاد آؤں تو۔۔۔،، ارشد محمود ارشد کا دوسرا شعری مجموعہ ہے جس میں انہوں نے محض ہجر و وصال اور گل و بلبل ہی کو موضوع نہیں بنایا ہے بلکہ اپنے عہد کے مشاہدات اور تجربات کو نہایت فنی چابک دستی سے بیان کر دیا ہے۔ شاعری میں اپنے عہد کو محفوظ کرنا ایک تخلیقی رویہ ہے اور ارشد محمود ارشد نے یہ ،، دشوار،، کام انتہائی آسانی سے سرانجام دے دیا ہے۔ ان کی شاعری میں جہاں ایک جانب روایت کی پاسداری ملتی ہے وہاں دوسری طرف جدید عہد کے تمام امکانات بھی جلوہ گر ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ ارشد محمود ارشد اپنی تخلیق کی تیسری آنکھ اور کشادہ کریں گے تاکہ کائنات کے پوشیدہ اسرار بھی ان پر ہویدا ہو جائیں۔

کرنل سید مقبول حسین۔۔ راولپنڈی۔ شاعری خیالات و احساسات کا آئینہ ہے ارشد محمود ارشد کے کئی مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں مضامینِ فطرت، عہد حاضر کے مسائل، جدید غزل کی طرف سفر اور دل فریب رچاؤ اس کی شاعری کے خصوصی رنگ ہیں وہ اپنی ذات کی تکمیل شاعری میں کرنا چاہتا ہے وہ دن دور نہیں جب کامیابی اس کے قدم چومے گی۔

غفار عاصم۔۔ ارشد محمود ارشد نے مشاہدات زندگی کو بہت خوبصورتی سے پیش کیا ہے ان کی غزل میں رومانوی رنگ نمایاں ہے۔ وہ کہیں نکھرے خوابوں کی بات کرتے ہیں تو کہیں حسرتوں کی سیج پر بکھری ہوئی زندگی کو سمیٹتے نظر آتے ہیں۔ وہ شاعری میں قدیم روایات کی ترجیحات کو پہلو بہ پہلو لے کر چلتے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے کلاسکی غزل کی روایت کو جدید انداز میں برقرار رکھا اور جمالیاتی قدروں کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ وہ گلشن ادب کی ایسی کھلتی ہوئی کلی ہے جس کی خوشبو آئندہ ادوار میں چہار دانگ پھیلے گی۔

کبھی میں یاد آؤں تو۔۔۔،،

سہیل غازی پوری

،، کبھی میں یاد آؤں تو۔۔۔،،
یہ ہے اک شعری مجموعہ
جو غزلوں اور نظموں سے مزین ہے
کہ ارشد اس کے شاعر ہیں
ردیفیں چُن کے لاتے ہیں
نئے انداز سے اشعار کا لہجہ بناتے ہیں
روایت کے تو حامی ہیں
مگر جدت کے رنگوں سے
وہ غزلوں کو سجاتے ہیں
،، عجب سی بے قراری ہے،،
تھا ان کا پہلا مجموعہ
جسے مقبولیت کی راہ پر
سب نے یہاں دیکھا
،، کبھی میں یاد آؤں تو۔۔۔،،
یہ ان کا نقشِ ثانی ہے
چلیں اب نقشِ ثانی کے
مناظر بھی ذرا دیکھیں
کہاں دل کے منظر کی جھلک آتی ہے
چہرے پر
تماشا ہے کہاں گرداب میں الجھا ہوا کوئی
کہاں سورج بھی اترا ہے
زمیں پر ظلم ڈھانے کو
کہاں ٹوٹے ہوئے پر سے
پرندے اڑ نہیں سکتے
کہاں صحرا ہی صحرا ہے
کہاں الجھے ہوئے حالات ہیں
اور دائرے بھی ہیں
کہاں کچی ہے نیند
اور جاگنے والا پریشاں ہے
کہاں پت جھڑ سے
رنگ چہرۂ گلچیں ہے مرجھایا
کہاں بپھرا ہوا دریا
کہاں خاموشیاں ایسی
کہاں آئینے ملتے ہیں
بہر نوع!
اور بھی گوشے ہیں پڑھنے اور پڑھانے کو
یہ مجموعہ! بہت ہی خوبصورت ہے
مبارک ہو تمہیں ارشد!!

منتخب کلام

غزل

موت دھلیز پر پڑی ہوئی ہے
زندگی سامنے کھڑی ہوئی ہے

درد بانٹے کسی کا کیا کوئی
سب کو اپنی یہاں پڑی ہوئی ہے

آ تو جاتے شمار میں اُس کے
یار چھانٹی بہت کڑی ہوئی ہے

وہ کسی اور کو نہ دیکھے گا
آنکھ جس سے مری لڑی ہوئی ہے

یہ نگینہ نہیں انگوٹھی میں
اس میں چاہت تری جڑی ہوئی ہے

آپ بیتی سنا رہے ہو مجھے
یا کہانی کوئی گھڑی ہوئی ہے

دیکھ بخیے اُدھڑ گئے ارشد
نیک نامی مگر بڑی ہوئی ہے

____

غزل

سرد لہجے کی شکایت نہیں کرنی مجھ کو
خونی رشتے سے عداوت نہیں کرنی مجھ کو

بھیگی پلکوں نے مرے دل کی کہانی کہہ دی
اب کوئی اور وضاحت نہیں کرنی مجھ کو

مجھ کو دو طرفہ محبت کا قرینہ نہ سکھا
پیار کرنا ہے، تجارت نہیں کرنی مجھ کو

اُس نے اک نام کے صدقے میں خدائی دے دی
وہ جو کہتا تھا سخاوت نہیں کرنی مجھ کو

کچھ تو شمشیر زنی کا بھی بھرم رکھنا ہے
اب کے دشمن سے رعایت نہیں کرنی مجھ کو

شاہ زادی! میں تجھے خواب دکھاؤں کیسے
جب قبیلے سے بغاوت نہیں کرنی مجھ کو

جن کو آتا نہیں وعدوں کو نبھانا ارشدؔ
ایسے لوگوں کی وکالت نہیں کرنی مجھ کو

غزل

بغضِ واعظ کے جو فتوے کی سند ہے رد ہے
اس میں ہر زیر زبر پیش کہ شد ہے رد ہے

تیرے لہجے کا تکبر ہو گوارا کیسے
نامور ہے تُو کہ چاہے ترا قد ہے رد ہے

اس فسانے میں حقیقت کا گماں تک بھی نہیں
یار اس طرزِ تخیل کی جو حد ہے رد ہے

میں کسی کی بھی وکالت نہیں کرنے آیا
میرے احباب میں کوئی بھی جو بد ہے رد ہے

کونسی چیز ہے خالص مجھے اتنا تو بتا
"جس طرف سے بھی ملاوٹ کی رسد ہے رد ہے"

تشنگی جسم کے صحرا کی مٹاتا بھی نہیں
تیرے دریاؤں کے پانی میں جو مد ہے رد ہے

میں نے ہر ایک سے تجھ کو ہی مقدم سمجھا
دلِ ارشد میں اگر تیرا حسد ہے رد ہے

غزل

ساغر یا پھر نینوں سے مے نوشی کی
یار وجہ کچھ ہوتی ہے مدہوشی کی

کل بھی بزمِ یاراں میں تھی بات چلی
کل بھی میں نے اُس کی پردہ پوشی کی

ملنا مشکل تھا تو مجھ کو بتلاتے
تم نے جانے کیونکر یوں روپوشی کی

سرد ہَوا کو لمس ملا جب آنچل کا
اُس نے میرے کانوں میں سرگوشی کی

کیا تھا اُس کا شعر ، " کہ مارا جاؤں گا "
ہاں میں نے آواز سنی تھی دوشی کی

تھوڑا سا ان ہونٹوں کو بھی جنبش دو
چیخ سنائی دیتی ہے خاموشی کی

عجلت میں ہر کام بگڑتا ہے ارشد
جھولی بھرتی ہے آخر سنتوشی کی

غزل

جب کسی ذات سے محبت کی
اُس کی ہر بات سے محبت کی

چار خوشیاں کشید نے کے لیے
لاکھ صدمات سے محبت کی

تم تو پیرس کی بات کرتے ہو
میں نے گجرات سے محبت کی

دھوپ کو بھی عزیز تر جانا
اور برسات سے محبت کی

راز فطرت کے مجھ پہ کھلتے گئے
جب مضافات سے محبت کی

دن کی تلخی اُنڈیل کر خود میں
چاند نے رات سے محبت کی

ہم تو مثلِ صبا رہے ارشد
خار، گُل، پات سے محبت کی

غزل

دوش پر جو سوار ہے پیارے
وہ تو مطلب کا یار ہے پیارے

تم جسے دردِ سر سمجھتے ہو
ایک گولی کی مار ہے پیارے

ساتھ چھوڑوں اگر مصیبت میں
میری چاہت کی ہار ہے پیارے

صاف کچھ بھی نظر نہیں آتا
وسوسوں کا غبار ہے پیارے

کھیل جاری ہے ایک مدت سے
ہر شکاری ، شکار ہے پیارے

تیری آنکھیں بتا رہی ہیں مجھے
تو بھی اختر شمار ہے پیارے

زخم ناسور بن گیا ارشد
تیرے اپنوں کا وار ہے پیارے

غزل

عجیب طرز کی آفت نے آ لیا ہے ہمیں
پیاسے لوگ تھے پانی نے کھا لیا ہے ہمیں

مدد کے واسطے آئے ہیں سلفیوں والے
کہ اک طرح سے تماشا بنا لیا ہے ہمیں

ہمارے نام پہ بھرنے ہیں پیٹ بھوکوں کے
اسی لیے ہی تو سر پر اٹھا لیا ہے ہمیں

کسی کی یاد کے سیلِ رواں میں بہہ جاتے
کسی کے ساتھ کے بند نے بچا لیا ہے ہمیں

کہ آسمان سے آفت اتارنے والے
زمین والوں نے کیا کم ستا لیا ہے ہمیں

بدن کی چوب تو بھیگی ہوئی تھی بارش میں
ستم شعار نے پھر بھی جلا لیا ہے ہمیں

ادھورے خواب کا ملبہ ہے آنکھ میں ارشد
یہ کچی نیند سے کس نے جگا لیا ہے ہمیں

غزل

ڈھونڈتی چہرہ کسی دن کھڑکیاں رہ جائیں گی
اور پسِ پردہ تمہاری ہچکیاں رہ جائیں گی

موت اپنے ساتھ لے جائے گی اُنگلی تھام کر
چاہنے والوں کی پیچھے سسکیاں رہ جائیں گی

اِس بہانے ہی سہی میں یاد آؤں گا تمہیں
فیس بُک کی وال پر جو سلفیاں رہ جائیں گی

پھول سارے چُن کے لے جائے گا گُلچیں باغ سے
دربدر یونہی بھٹکتی تتلیاں رہ جائیں گی

جب خزائیں نوچ لیں گی سبز شاخوں کا لباس
ہجر اُوڑھے زرد رنگی ٹہنیاں رہ جائیں گی

جس گھڑی چاہے گا ڈوری کھینچ لے گا بازی گر
اُنگلیوں پہ ناچتی کٹھ پُتلیاں رہ جائیں گی

یہ کہاں سوچا تھا ارشد ہم ملیں گے اِس طرح
روبرو ہوتے ہوئے بھی دوریاں رہ جائیں گی

غزل

اس نے پوچھا کہ محبت میں زیاں ہوتا ہے
میں نے ہنس ہنس کے کہا ، یار کہاں ہوتا ہے

تم جسے اشک سمجھتے ہو حقیقت میں کہوں ؟
وہ تو جلتے ہوئے خوابوں کا دھواں ہوتا ہے

دکھ کبھی چیر کے دل کو نہیں ناپا جاتا
کرب چہرے کے مساموں سے عیاں ہوتا ہے

اس محبت نے عجب حال کیا ہے اب تو
وہ کہ ہوتا ہی نہیں جس کا گماں ہوتا ہے

لاکھ چاہو بھی بھلانا تو نہ بھولا جائے
جو کہ رگ رگ میں لہو بن کے رواں ہوتا ہے

یار اس طرزِ تخاطب پہ کبھی غور تو کر
تلخ لہجے میں کہا لفظ گراں ہوتا ہے

بے سبب تو نہیں اس دل کا مچلنا ارشد
عشق برسات کے موسم میں جواں ہوتا ہے

غزل

میں سوچتا ہوں جہاں میں کیا تھا خدا سے پہلے
کہ سانس لینے کو اور کچھ تھا ؟ ہَوا سے پہلے

ہم ایسے لوگوں کی زندگانی بھی کیا عجب ہے
فنا کے بارے میں سوچتے ہیں بقا سے پہلے

تُو چاہتا ہے مراد پوری اگر ہو تیری
تو آنسوؤں کا وضو ہے لازم دعا سے پہلے

مثالِ صحرا جھلس رہا ہے بدن ہمارا
کوئی تو سانسوں کا لمس بھیجے گھٹا سے پہلے

حجاب چہرے کو ڈھانپ لینا ہی تو نہیں ہے
حیا نظر کی بھی ہے ضروری ردا سے پہلے

کبھی وہ مجھ کو پکارنے کا گمان کرتا
میں اُس کی جانب پلٹ کے جاتا صدا سے پہلے

غرور توڑا ہے تیرگی کا دیے نے ارشد
سیاہ شب کا تھا رقص ہرسُو ضیا سے پہلے

ماہ رو خان کے لیے ایک نظم

وہ ایک لڑکی !

کہ جس کی آنکھیں ہیں جھیل جیسی
نظر اٹھا کر جسے بھی دیکھے نہال کر دے
کہ اس کی پوروں کا لمس پاتے ہی سنگ ریزے
دھڑکنے لگ جائیں،
جانے کیا وہ کمال کر دے
تراش ہونٹوں کی اس طرح ہے کہ لب کُھلیں تو
خزاں رتوں میں بہار موسم بحال کر دے
کہ عمر بھر کی وہ قید ہنس کر قبول کر لے
وہ جس پرندے پہ اپنی زلفوں کا جال کر دے
جلائے شمعِ حُسن جب وہ تو پھر پتنگے
لپک کے ایسے پڑیں کہ لاکھوں قتال کر دے
وہ ایک لڑکی !
کہ جس کہ آنکھیں ہیں جھیل جیسی
میں رازِ ہستی اسے بتانے کا سوچتا ہوں
کہ اُس کی آنکھوں میں ڈوب جانے کا سوچتا ہوں

ابنِ آدم

کوئی جب پوچھتا ہے یہ
شیعہ ہو تم یا سنی ہو
وہابی ہو کہ دیوبندی
بتاؤ کونسے فرقے سے نسبت ہے
نجانے کیوں مجھے اک پل
سجھائی کچھ نہیں دیتا
میں گہری سوچ میں تب ڈوب جاتا ہوں
مرے اندر سے اک آواز آتی ہے
سنا ہے تم نے بچپن سے
کہ تم تو ابنِ آدم ہو
تو پھر سچ سچ بتاؤ نا
مسلمانوں کے فرقے کیا
کہ ہندو، سکھ، نصاریٰ
پارسی تک بھی
جہاں میں جتنے انساں ہیں

مرے بابا کے بیٹے ہیں
یہ مانا شکل و صورت میں
ذرا سے مختلف ہونگے
رگوں میں دوڑتا ہے جو
لہو تو ایک جیسا ہے
سبھی اولادِ آدم سے
کہ جس میں آدمیت ہو
مری تو اس سے نسبت ہے
اسی سے خون کا رشتہ
یہی سچ ہے
کہ جب میں ابنِ آدم ہوں
مرا مذہب وہی ہے جو
مرے بابا کا مذہب ہے

سنو! لڑکی

یہ تم نے کیا ستم ڈھایا
کہاں لب کھول بیٹھی ہو
یہاں تو ایک مدت سے
کڑے پہرے ہیں سوچوں پر
لبوں پر ہیں پڑے تالے
فقط اِک دائرے میں ہی مقید رہ کے جینا ہے
سنو! لڑکی
یہاں آنکھیں۔۔۔
فقط آنسو بہاتی ہیں تمناؤں کی لاشوں پر
اِنہیں سپنے سجانے کی
اجازت ہی نہیں ہوتی
سنو! لڑکی
یہاں کے سب قوی اپنا
الگ دستور رکھتے ہیں، الگ منشور رکھتے ہیں
یہاں کے ناتوانوں پر
اطاعت سب کی لازم ہے
کسی دستور کا مُنکر
سزائے موت کا حقدار بنتا ہے

بیوپار ــــ

لاؤ مجھ کو دکھلاؤ تو
آنکھوں میں ہیں کیسے خواب؟
کچے ہیں یا پکے خواب؟
اچھا ان کے دام بتاؤ
دیکھو اتنا ذہن میں رکھنا
اس بازار میں خوابوں کے اب دام گرے ہیں
سچ سچ میں اک بات بتاؤں؟
برسوں پہلے میں نے بھی یہ کام کیا تھا
خواب بنے تھے خواب تھے بیچے۔
مجھ کو تو یہ گورکھ دھندہ راس نہ آیا
نیند گنوائی چین گنوایا
دیکھو میرا کہنا مانو
ایسا کاروبار نہ کرنا
خوابوں کا بیوپار نہ کرنا
ایسے کاروبار میں اکثر
گھاٹا سہنا پڑتا ہے
کچے سپنے ٹوٹ گریں تو
آنکھیں چھلنی کرتے ہیں
نیند کا پنچھی کھو جاتا ہے
جینا مشکل ہو جاتا ہے

محبت

محبت باعثِ تخلیقِ دنیا میں نے مانا ہے
محبت ابتداء ہے، انتہا ہے کیا فسانہ ہے

محبت راز ہے ایسا جسے پانا نہیں آساں
محبت لُوٹ لیتی ہے کبھی تن من ، یہ جسم و جاں

محبت ناچتی ہے من کے آنگن مور کی صورت
محبت باندھتی ہے دل سے دل کو ڈور کی صورت

محبت پیاس صحراؤں کی پل بھر میں مٹا ڈالے
محبت سوکھتی شاخوں پہ بھی غنچے کھلا ڈالے

محبت زندگی میں کہکشاں کے رنگ بھرتی ہے
محبت دل کی سب تاریکیاں تابندہ کرتی ہے

محبت زندگی کے گیت کا سُرتال ہوتی ہے
محبت دل کے پنچھی پہ سنہرا جال ہوتی ہے

محبت تشنہ لب رہ کے کبھی اک بوند کو ترسے
محبت دل کے صحرا پہ گھٹا بن کر کبھی برسے

محبت رسمِ دنیا کے کبھی تابع نہیں آتی
محبت دل میں بس جائے ، کسی صورت نہیں جاتی

محبت تپتے صحرا پہ برہنہ پاؤں چلتی ہے
محبت آتشِ نمرود میں بے خوف جلتی ہے

محبت بپھری لہروں میں اترنے سے نہیں ڈرتی
محبت زہر پی کر بھی کبھی اُف تک نہیں کرتی

محبت چڑھ کے سولی پر بھی اپنا آپ منوائے
محبت جس کی دل میں ہو زباں بھی اس کی ہو جائے

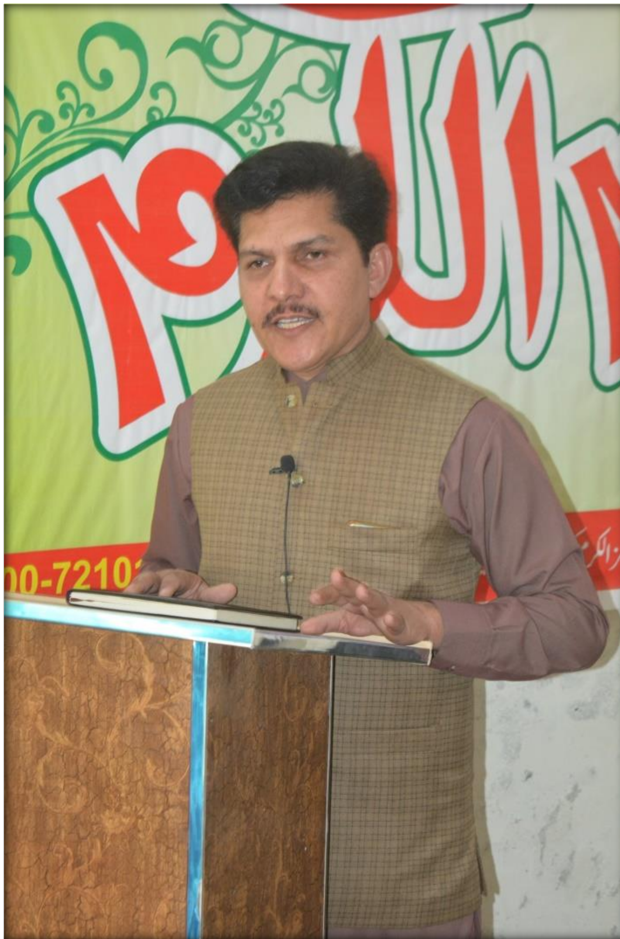
محبت جس کو چاہے جس طرح منصب عطا کر دے
محبت آدمی کو کا ہی خدا کر دے

مورتی

میں اکثر سوچتا ہوں
کیا کہوں میں کیا لکھوں تجھ کو
ہے کوئی اپسرا تُو یا کہ پھر ہے روپ کی دیوی
تُو جو بھی ہے
حقیقت میں ہے اِک شہکار قدرت کا
کئی صدیاں سفر کر کے
تخیل یوں نکھرتا ہے
یونہی پل میں ترے جیسی کوئی مورت نہیں بنتی
چنبیلی ، موتیا ، نرگس ، گلِ لالہ ، کنول ، صندل
سبھی کا رس نچوڑا اور ملا کر بُھربھری مٹی
گھوما کر چاک کا پہیہ
تراشا اِک حسیں پیکر
تبھی پھولوں کی خوشبو سے
مہکتا ہے بدن تیرا
لبوں کی پنکھڑی اُس نے
بنائی ہے گلابوں سے
یہ کالی ریشمی زلفیں
ہزاروں سال تک ریشم
جمع کر کے بُنی اُس نے
کُتر کر پنکھ موروں کے
تری پلکیں تنی اُس نے
پھر اُس کے بعد کن کہہ کر
مکمل کر دیا تجھ کو

سوداگر

سنو!
میں ہوں کچھ بیچنے آیا
اگر تم کو ضرورت ہو
تو پھر کچھ بھاؤ کرتے ہیں
مرے حصے کی سب خوشیاں
مرے ہونٹوں کی ہر مسکاں
مری یہ روح یہ جسم و جاں
تم اپنے نام لکھوا لو
میں ہوں بے نام اک بندہ
کہ سب کچھ مجھ سے لے کر تم
مجھے اک نام دے دینا
کہ اپنی زندگانی سے
مجھے اک شام دے دینا


00-7210